

رِشَاطِ غَالِب



و جاہت علی سندیلوی

نشاطِ غالب

وجاہت علی سندیلوی

غالب اکیڈمی

بہشتی حضرت نظام الدین، نئی دہلی - 110013

نشاطِ غالب

وجاہت علی سندیلوی

بار اول: 1964ء

ادارۂ فروغِ اردو لکھنؤ

بار دوم: اگست 2010ء

غالب اکیڈمی

بہتی حضرت نظام الدین، نئی دہلی - 110013

مطبع : نیو پرنٹ سنٹر دریا منیج، نئی دہلی

ISBN: 978-81-904001-2-1

نظارہ کیا حیف ہو اُس برقی حسن کا
جوش بہ سار جلوے کو جس کے نقاب ہو

نشاطِ غالب

مُصَنَّفہ

وجاہت علی سندیلوی

نشاطِ غالب

مرزا غالب کے قریب ساٹھ ایسے اشعار پڑھنے کے متعلق اُن کے مختلف شارحین کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے یا جن کے متعلق بعض حضرات نے یہ اعتراض کیا ہے کہ وہ پیش زد شعرا کے بعض اشعار کی عکاسی کرتے ہیں، شارحین اور معترضین کے اقوال کی روشنی میں بحث و تبصرہ۔ ساتھ ہی ساتھ غالب کے غیر متداول کلام کے چند اشعار کی، جو عام طور سے دیگر شرحوں میں نہیں پائے جاتے ہیں شرح بھی پیش کی گئی ہے۔ آخر میں غالب کے متداول اور غیر متداول کلام کا ایک مختصر انتخاب بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

مُحِبَّتِ اور مُلُوصِ کے ساتھ

لپے بھائی، ریشمی، اور قدردان

سید اسرار مسعود حسنا

کے نام

تیری وفا سے کیا ہو سکتی کہ دہریس

تیرے سوا بھی مجھ پہ بسکے ستم ہوئے

فہرست

صفحہ	ترتیب	نمبر شمار
	انتخاب	(۱)
	پیش لفظ	(۲)
	قرشی صاحب کا مکتوب	(۳)
	اشعار زیر بحث	
	(الف) —————	
	(۴) نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا۔	
	(۵) آج داں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں۔	
	(۶) ترے دھڑکے پر جئے ہم تو یہ جان، جھوٹ جانا۔	
	(۷) کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟	
	(۸) گلا ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا۔	
	(۹) ہنوز محرمی منں کو ترستا ہوں۔	
	(۱۰) جیباں اور ہڈیم نے سے یوں تشنہ کام آؤں۔	

نمبر شمار	ترتیب	صفحہ
(۱۱)	ذرہ ذرہ ساغرے غاۓ انیر بھگے۔	
(۱۲)	کوئی دیرانی سخی دیرانی ہے۔	
(۱۳)	پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟	
(۱۴)	ہے کہاں تنہا کا دوسرا قدم یا رب؟	
(۱۵)	استدئے حجاز دے سامانی فرعون توام ہے۔	
(۱۶)	طاؤس در رکاب ہے، ہر ذرہ آہ کا۔	
————— (ب) —————		
(۱۷)	ہے مگر موقوف بد وقت، دگر کار استد۔	
————— (ج) —————		
(۱۸)	ہوں داغ نیم رنگی شام وصالِ یار۔	
————— (د) —————		
(۱۹)	کون ہوتا ہے حریت مے مرد انگلیں عشق؟	
————— (س) —————		
(۲۰)	چھوڑوں گائیں نہ اُس بُت کا فر کا پُرجنا۔	

صفحہ	ترتیب	نمبر شمار
		(۲۱) لرزتا ہے مراد دل ز محبت مہر درخشاں پر۔
		(۲۲) یارب، نہ بگے ہیں نہ بھیں گے مری بات ا
		(۲۳) ہر چند ٹھک دست ہوئے بس شکنی میں۔
	(ز)	
		(۲۴) تو اور آراشیں خیم کا کٹی۔
	(ح)	
		(۲۵) تاشائے گلشن، تنائے حیدر۔
	(ن)	
		(۲۶) سلطنت دست پرست آئی ہے۔
		(۲۷) آرائش بہاں سے فارغ نہیں ہنوز۔
		(۲۸) خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار۔
		(۲۹) نینلاؤں کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں۔
		(۳۰) لینا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے۔
		(۳۱) پانی سے سگ گزیرہ ڈرے جس طرح اسد۔
		(۳۲) دیر و حرم آئینہ تکرار توتا۔

ترتیب

صفحہ

نمبر شمار

(۹)

- (۳۲) جب میکہ چھٹا تو پیراب کیا بگ کی قید۔
 (۳۳) وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب رپوڑ ناٹھرا۔
 (۳۴) قفس میں مجھ سے رکو داد چمن کہتے نہ ڈر ہدم۔

(۱۰)

- (۳۵) ہے بزم بٹیاں میں سخن آذرہ لبوں سے۔
 (۳۶) ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے۔
 (۳۷) ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن۔
 (۳۸) موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ بنے۔
 (۳۹) قیام مستحکم کہ ہوئے نذہمی کا ہم سفر غالب۔
 (۴۰) نشر ہا شاواہے بگے ساز ہا مسو ط سکر۔
 (۴۱) شبنم، گل لالہ نہ خالی زاد ہے۔
 (۴۲) دل خوں شدہ کشمکشیں حسرت دیدار۔
 (۴۳) قمری کعبہ خاکستر دلیل قفس رنگ۔
 (۴۴) ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد۔
 (۴۵) گنا مجھ کے وہ چپ تھا، سری جو شامت لگے۔

نمبر شمار	ترتیب	صفحہ
(۴۷)	نگہ سہار حسرت تھامے آبادی پہ دیرانی ۔	
(۴۸)	دام گاہ و مجھ میں سامان آسائش کہاں ؟	
(۴۹)	طاؤس خاک حسن نظر باز ہے مجھے ۔	
(۵۰)	دسل میں دل انتفا طفس رکھتا ہے مگر ۔	
(۵۱)	گدسلے طاقیت تقریر ہے زباں بھڑکتے ۔	
(۵۲)	فسر دگی میں ہے فریاد بے دلاں بھڑکتے ۔	
(۵۳)	پری بہ شیشہ رخ اندر آئی سسر ۔	
(۵۴)	ہمارے حسرت زنگارہ تخت جاتی ہے ۔	
(۵۵)	طراوت سحر ایجاد ی: ٹریک سو ۔	
(۵۶)	چمن چین گل آئی سسر در کنار ہوس ۔	
(۵۷)	نیاز پردہ افکار خود پرستی ہے ۔	
(۵۸)	ہمارے جونی رحمت، کہیں مگر تقریب ۔	
(۵۹)	آسہ بہ سو سیم گل در طلسم منجی نقص ۔	
(۶۰)	انتخاب کلام غالب	

پیش لفظ

کیا فارسی، کیا اُردو، کیا نثر، کیا نظم؟ غالب کی طرف سے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے۔

ہزار معنی، سرچشمن خاص نطق من است
کذاہل قدق دل و گوئے از محل بردست

فارسی سے انھیں خاص مناسبت اور فطری لگاؤ تھا اور اس کے رموز و نکات ان کے ذہن میں ایسے رچے ہوئے تھے جیسے بقول خود ”فولاد میں جوہر“ انھیں فارسی میں قادر الکلامی اور جولا فی طبع دکھانے کا جو میدان میسر تھا وہ اُردو میں ہرگز نہیں تھا۔ لیکن اب فارسی میں انھیں سمجھنے اور داد بخشنے والے ہمارے درمیان کہاں؟ بس یوں سمجھ لیجئے کہ جب خود اُردو کے، جس نے اسی دیش میں جنم لیا، یہیں ملی، پڑھی، پروان چڑھی، اور یہیں جوان ہونے پر جس نے اپنی گل نشانی گفثار، سے ہر چھوٹے بڑے کا دل ٹوہ لیا، اور جو نہ صرف ایک صینی جاگتی دل آویز زبان بلکہ بذاتِ خود ایک ایسا تہذیب بھی ہے کہ جس کے قومی یک جہتی کے سنگم پر کوثر اور گنگا کے دھارے شیر و شکر ہو کر ملتے ہیں، ہمارے ملک میں پڑھنے والے اور جاننے والے کم سے کم تر ہوتے چلے جاتے ہیں، تو پھر فارسی کا ذکر ہی کیا؟ لہذا بصورتِ موجودہ غالب کے فارسی میں وہ

”نقشبائے رنگ رنگ“ جن میں انھوں نے اپنے خونِ جگر سے رنگ آمیز کیا
کی تھی، ہماری نظروں سے قریب قریب اوجھل ہیں اور ہم غالب کی
صحیح ادبی حیثیت متعین کرنے سے بڑی حد تک قاصر ہیں۔

اُردو میں لے لے کر غالب کا ایک بہت مختصر متداول دیوان ہے
اور کچھ نئی خطوط، جو انھوں نے اپنے دوستوں اور شاگردوں کو مسلم
برداشتہ لکھے تھے اور جن کو لکھتے وقت ان کے دہم و گمان میں بھی نہیں
نفا کہ ان کی اشاعت کی بھی کبھی نوبت آ سکتی ہے۔

اپنے اُردو کلام کے متعلق غالب نے ذوق کو مخاطب کرتے ہوئے
کہا تھا کہ

فارسی میں تا بہ بینی نقشبائے رنگ رنگ

گزر از مجموعہ اُردو کہ ہے رنگ من است

اور اپنے نئی خطوط کے متعلق ایک دفعہ ارشاد فرمایا تھا کہ ان کی اشاعت
میرے ”شکوہٴ سخنوری“ کو سدِ مہ پونجی جانے کا احتمال ہے، ان
خطوط کی نقلیں اپنے پاس رکھنے کا انھیں کبھی خیال ہی نہیں پیدا ہوا
اور ان کا بہت بڑا حصہ خود غالب کی زندگی میں تلف بھی ہو چکا تھا۔

لیکن یہی بچا کچھ مالِ غنیمت جو اُردو کے ہاتھ لگا، اس کے لئے
ہفتِ قلم کے خزانوں سے کم گراں قدر ثابت نہیں ہوا۔ بے رنگ
مجموعہٴ اُردو، ساری نفا کو رنگینیوں سے معمور کر کے اُردو شاعری کے
چمن پر ایک بہارِ بہ خزاں بن کر چھا گیا۔ کوئی ڈاکٹر عبدالرحمن بھنورچی

اس قول میں کہ ”ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں مقدس وید اور دیوان غالب“ ان کا ہم نوا ہو یا نہ ہو یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ دیوان غالب سے زیادہ عمدہ فرسے محیفہ کم سے کم اُردو میں اور کوئی نظر نہیں آتا۔ غالب کے بعد آنے والی نسلوں کو اس نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے اور اس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ جتنا اس مقابلہ مختصر دیوان پر لکھا گیا ہے اتنا اُردو کی کسی دوسری کتاب پر نہیں بلکہ شاید یہ کہنا بھی غلط نہ ہو گا کہ اُردو کے تمام غزل گو شعرا پر مجموعی طور سے بھی اس قدر کتابیں اور مضامین نہیں ملتے ہیں جس قدر کہ تنہا غالب پر غالب کے بعد اگر کسی شاعر پر لکھا گیا ہے تو علامہ اقبال پر جو ایک مبلغ اور بامقصد شاعر تھے، لیکن طرزِ بیان کی حسبِ انگیز مماثلت کے باوجود دونوں کی شاعری کے میدان بہت مختلف تھے۔

اور غالب کے انہیں نجی خطوط نے جنہیں وہ کبھی اپنے شکوہٴ سخنوری کے متافی سمجھتے ایک ایسے مردِ نگارش کی بنیاد رکھی کہ جس سے اُردو نثر جدید کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ ان خطوط نے اُردو نثر کو بے باقیت اور مختلف، فارسی کی نقل اور پُر پیچ عبارت آرائی کے طلسم سے آزاد کر کے طوطا مینا، جن اور پری، شہزادوں اور درویشوں کی زبان کے بجائے ہم عام انسانوں کے پوچھنے اور کہنے کی زبان بنانے کے سلسلے میں جو خدمت انجام دی۔ ہے اُس کے پیش نظر نقادانِ ادب کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ شاعر غالب بڑا ہے یا انشا پر داز غالب۔ مزاج اور بے تکلفی کی پابندی میں

آواز خیالی کے ہاتھوں اس کے جسم پر یہ قبا جگہ جگہ چاک بھی نظر آتی ہے وہ زندگی ہی کی طرح سیدھا بھی ہے اور پُرچھ بھی، قدامت پرست بھی ہے اور انقلاب پسند بھی۔ غیر ضروری طور سے سنجیدہ بھی ہے اور ضرور سے زیادہ شوخ بھی۔ بے مقصد بھی ہے اور خود ہی اپنا مقصد بھی۔ اس کی بذلہ سنجی اور مزاح کا لطیف جس جو اسے دوسروں پر کیا خود اپنے آپ پر سننے اور سُنے جڑ جانے پر مجبور کر دیتا ہے، اس کا رازِ حیات میں خود اعتمادی اور بالغ فطری کا ایک نیا احساس اور دلولہ عطا کھرتا ہے۔ اور پھر اس پر طرہ یہ کہ اس کا انداز بیان ایسا دل فریب اور پُرکشش ہے کہ اس کے سُنے سے نکلی ہوئی معمولی سے معمولی بات پائے سحر و عجاظ کو پہنچ جاتی ہے۔

دیکھنا نقشبندی کی لذت کہ جو اس نے کہا

نہ نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

غالب کی تعریف اور توصیف کرنے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ ان کا کلام غلطیوں سے بالکل مُبرا ہے یا اُنہوں نے بہت اشعار نہیں کہے ہیں یا اُنہوں نے تمام ممکن موضوعات سخن کو اپنا لیا تھا، یا اُنہوں نے جس مضمون پر شعر کہا ہے سب شعرا سے بہتر کہا ہے، یا اُنہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ حُسنِ آفر کا درجہ رکھتا ہے اور اس سے بہتر نہ کہا گیا ہے نہ کہا جاسکتا ہے۔ ایسا خیال بھی کھانا صرف غلط بلکہ مضحکہ خیز ہوگا۔ حقیقت مندی کے جوش میں حقیقت پسندی کا ہوش ضرور باقی

رہنا چاہئے۔ خواہ وہ غالب ہو یا کوئی بھی دوسرا شاعر، اس کے مرتبے کے بقین کے لئے پہلے اس کے بہترین کلام کو پیش نظر رکھنا چاہئے، اور پھر یہ دیکھنا چاہئے کہ اس کے بلند پایہ، اوسط درجے اور پست قسم کے کلام کا تناسب کیا ہے۔ غالب کے کلام کا معیار جتنے بلند پایہ ہے۔ اوسط درجے کا کلام اس سے کچھ ہی زیادہ ہو گا اور پست قسم کا کلام کم بلکہ بہت ہی کم ہے حتیٰ کہ دو تین فی صد ہی بھی نہیں ہو گا۔ اور اس معیار پر غالب اور اقبال کے علاوہ بہت ہی کم دوسرے شعرا پورے اتر سکیں گے۔

غالب کے کلام کو تین منفرد و منفرد اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلی قسم میں ان کی بے دلائل شاعری ہے۔ یہ نہ صرف فارسی ترکیبات سے گراں بار ہے بلکہ معنوی حیثیت کا بھی مشکل اور پیچیدہ ہے۔ یہ دل کی انہیں دماغ کی شاعری ہے۔ اس میں قادر الکلامی اور پرداز تخیل زیادہ اور لطافت اور بے ساختگی کم ہے۔ یہ ان کی نو عمری کی تجرباتی شاعری تھی۔ اس سے ان کی منفرد طبیعت، غیر معمولی ذہانت اور قدرت اظہار کی فرادانی کائنات پتہ چلتا ہے اور اس میں بھی صنعت ایجاد، جوش و نگاہ، نشاط تصور کی وہ سرشاریاں اور کرشمہ ساریاں کار فرما نظر آتی ہیں کہ پڑھنے والا حسی طور پر زندہ رہ جاتا ہے۔ چونکہ اُردو کی مروجہ شاعری سے اس کا پیوند نہیں ملتا تھا لہذا غالب نے خود اس کلام کا بہت بڑا حصہ قلم زد کر کے اپنے مہداون دیوان میں شامل نہیں کیا تھا۔

ان کے کلام کی دوسری قسم وہ ہے جس میں انہوں نے اپنے زمانے کے ردائی

موضوعات سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ یہ اُن کے کلام کا سب سے بڑا حصہ ہے اور اسے ہم صرف اوسط درجے کی اچھی شاعری کہہ سکتے ہیں۔ شاعری کی پامال شاہ راہوں میں بھی اپنے منفرد زاویہ نگاہ اور انداز بیان سے انھوں نے اپنے علاوہ راستے نکالنے کی کوششیں کی ہیں، تاہم یہ اُن کی بہترین شاعری نہیں ہے۔ یہ اُن کی جذبات طرازی، ذاتی لہجے اور نظری اُتار کے کچھ زیادہ میل نہیں کھاتی ہے۔ اس کلام میں ایک بہت قلیل جزو ایسا بھی ہے جو دوسروں کے لئے قابل قبول ہو تو ہو غالب کے شایان شان نظر نہیں آتا، لہذا ہم اس کو ان کا بہت کلام کہہ سکتے ہیں خوش قسمتی سے اس کی مقدار بہت حقیر ہے۔ اپنے اوسط درجے کے کلام میں بھی غالب کی انفرادیت بحیثیت شاعر اس کی شخصیت کا خلاصہ دراز مزاج پسندی صاف جھلکتی نظر آتی ہے۔

ان کے کلام کی تیسری قسم وہ ہے جس میں مضامین کی ندرت تخیل کی ہمہ گیری، مزاج کی بے ساختگی، زبان کی لطافت اور بیان کی سلاست میں وہ انتہائی کمال پر نظر آتے ہیں۔ اس کلام پر خود ان کا قول سن

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت لہجے
کہتے ہیں کہ غالب کا بے انداز بیان اور

حریت بھارت صادق آئے ہے۔ یہاں خواہ مسائل تصوف ہوں۔ خواہ رموز حیات، خواہ مسائل ہندی، خواہ حُسن و عیش کی پرانی چیر و چھاڑ، خواہ دُسل ہو، خواہ سُمران، خواہ غم زدگار ہو خواہ نشاط زندگی،

خواہ شادیات ہوں خواہ محسوسات اور خواہ صبرِ صرطِ زاد اور لطف
 اظہار ہو غالب ہے کراں اور بے پناہ نظر آتے ہیں۔ ایک ایک شعر پر کیا
 ایک ایک لفظ پر ان کی ٹھٹھکی۔ مسلم الثبوت اساتذہ کے بیسیوں شعرا
 میں ان کا ایک شعر رکھ دیجئے اُس کی شان فراموشی دکھائی پڑے گی اور
 وہ خود بول اُٹھے گا کہ میں غالب کے ذہن رسا کی پیداوار ہوں۔ اسی
 کلام نے غالب کو غالب بنایا ہے۔ اور یہ صریح اُردو شاعری میں کیا
 دنیا کے شاعری میں بلند سے بلند مقام پانے کا مستحق ہے۔ اور اسی کے لئے
 انہوں نے بالکل بجا طور سے کہا ہے یہ

گنجینہٴ معنی کا طلسم اس کو سبھی

جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

میرا مستقل پیشہ وکالت ہے جس کو شعرا دیکے دور کا بھی لگاؤ نہیں
 ہے۔ لیکن میں نے اپنی فرصت کے مختصر اور منتشر لمحات میں غالب کو اور
 اُس سے متعلق لٹریچر کو، جو کچھ بھی مل سکا پڑھا ہے۔ دیوان غالب کو
 مستقل پڑھنا ہی رہتا ہوں۔ میں سخنِ نہم تو خیر کیا شاید غالب کا طرفدار
 کہا جاسکتا ہوں۔ لیکن آخر یہ طرفداری ایسی کیوں ہے؟

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

میں غالب پرستی کے فیشن میں نہیں غالب کو اپنی بساط بھر سمجھنے کی کوشش
 کر کے اُس کا طرفدار بنا ہوں، بلکہ کچھ پوچھئے تو اندھی تقلید اور فیشن کی
 دیس سے میں اس قدر مستغفر ہوں کہ جب میں نے زیادہ تر لوگوں کا ترجمان

غالب کی طرف دیکھا تو میں نے پہلے اس کے معترضین ہی کو پڑھنے کی کوشش کی لیکن ان کے پاس سے سولے اس کے کچھ نہیں ملا کہ غالب مشکل اور مغلّٰں کہتے تھے (غالب انہوں نے غالب کے مشکل اور مغلّٰں اشعار کے رموز و نکات اور حسن معنی پر غور کرنا ضروری نہیں سمجھا، یا پھر ان کے مقابلہ آسان کلام کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا) غالب مہل کہتے تھے رفاغالب کا ایک شعر بھی مہل نہیں ہے، غالب کے یہاں بعض مقامات پر تعقید لغوی اور تنافر ہے اور انتخاب الفاظ صحیح نہیں ہے، انہوں نے بعض غلط الفاظ کا بہ استعمال کیا ہے جیسے ضروری الاظہار، محشرستان (اس کے علاوہ بھی غائب کے یہاں بہت کچھ ہے اور اُس نے جن نئے الفاظ کا اردو ادب میں اضافہ کر دیا ہے ان کے مغلّٰں کیا خیال ہے؟ ضروری الاظہار اور محشرستان بالکل صحیح الفاظ ہیں) غالب گھٹا پھرا کلمات کہنے کے عادی تھے (اعتراض صحیح نہیں ہے، غالب نے پہلو دار الفاظ ضرور کیے ہیں لیکن اس صفت سے ان اشعار کا حسن بھی دو بالا ہو گیا ہے) غالب نے اپنے پیش رو شعرا کے بعض اشعار کی عکاسی کی ہے (اول تو ایسے اشعار کی جن پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے تعداد ہی کتنی ہے، اور پھر کیا یہ بات غالب کے لئے لائق تائید نہیں ہے کہ اگر اُس نے کسی عام مکتعہ الورد یا پامال مضمون پر بھی طبع آزمائی کی ہے تو اس نے اس کو ترقی دے کر پہلے سے بہتر اور موثر انداز میں پیش کیا ہے) وغیرہ وغیرہ۔ ان اعتراضات کا یا اس کا عیب کے دیگر اعتراضات کا، اگر وہ ایک مدت تک درست بھی

ہوں، غالب کی عظمت کو کوئی ایسا نقصان نہیں پہونچتا کہ جس سے ان کے مرتبے کے تعین کے لئے نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی جائے۔ غالب کے ذوق البشر یا عقل کل ہونے کا دعوئے نہ آج تک کیا ہے اور نہ بعید ہوش و حواس کر سکتا ہے۔

غالب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن ابھی تک ۔۔۔

بہت نکلے مرے ارمان پیر بھی کم چلے

والا مضمون ہے۔ غالب کو پڑھتے پڑھتے مجھے بھی انہی کے متعلق کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ پہلے پہل تو یہ خیال بڑا دل شکن تھا کہ جس میدان میں بڑے بڑے نقادان فن کے پڑ جلتے ہیں وہاں میرا ایسا کم سواد قدم رکھنے کی جرأت کس پر ہے پھر کر سکتا ہے ۔۔۔

تو پست فطرت اور خیال بےا بلند

لے فضل خود معاملہ شکستہ عصا بلند

لیکن پھر یہ سمجھ کر کہ غالب نے صرف نقادان فن کے لئے نہیں بلکہ بعینہٴ میرے جیسے عام انسانوں کے لئے بھی شعر کہے ہوں گے۔ میں نے مطالعہ میں غالب پر اپنی پہلی تصنیف ”باقیات غالب“ پیش کی۔ اس میں میں نے کچھ تنقیدی مضامین کے ساتھ غالب کے غیر متداول کلام کا انتخاب اور اس کے مطالب بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ اس پر ارباب ذوق نے میری ہمت افزائی فرمائی۔

سلہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نائب صدر جمہوریہ ہند نے اس کے متعلق (باقی صفحہ پر)

باقیات غالب کے بعد غالب کے بعض ایسے اشعار، جن کے متعلق بعض شاعریں کے بتائے ہوئے مطالعے میں نے اپنے آپ کو متفق نہیں پایا تھا، میں نے اخبارات اور رسائل کے لئے چند مضامین لکھے اور پھر اس شوق نے کچھ اور ترقی کی طرف رخ دیا۔ یہ کتاب مرتب ہو گئی۔

اس کتاب کو پیش کرتے ہوئے مجھے اپنی کم علمی کا اعتراف ہے۔ میرا یہ دعوئے ہرگز نہیں ہے کہ غالب کے کسی شعر کا جو مطلب میں نے عرض کر دیا ہے وہ مختتم یا فیصلہ کن ہے۔ ہر شعر کا مطلب سمجھنے کے لئے ناظرین کو اپنے ذاتی ذوق سلیم کا سہارا لینا پڑے گا۔ اس تصنیف سے میری سب سے بڑی غرض یہ ہے کہ لوگوں کے غالب پڑھنے اور سمجھنے کے

(بقیہ حاشیہ ص ۲۱) مصنف کو لکھا "آپ کی کتاب بہت خوبصورت ہے اس سے بہت کچھ سیکھا" ناشر

اتحاد علی عرش صاحبہ مشہور ماہر غالبیات جن کی تالیف دیوان غالب (نسخہ مرثی) پر انہیں ساہتہ اکیڈمی کی جانب سے پانچ ہزار روپیہ کا انعام بھی مل چکا ہے، نے باقیات غالب کے متعلق تحریر فرمایا تھا۔ آپ نے جو کچھ لکھا، بڑی محنت اور بصیرت سے لکھا ہے۔ جزاک اللہ! دوران مطالعہ موجودہ کتاب کے متعلق انہوں نے اپنی رائے کا یوں اظہار کیا ہے یہ آج کل نشاط غالب کے مطالعے میں مصروف ہوں اور آپ کو داد دے رہا ہوں۔ کاش آپ غالب کے حوالے میں ہوتے۔ اس فریگ آپ جیسے شاعر فہم کہاں مل سکے؟

ناشر

ذوق و شوق میں اضافہ ہو۔ غالب کی تلاش میں، میں ان کا رہبر نہیں،
صرف ہم غریبناچا ہوتا ہوں۔

نشاط غالب کی نگین کے بعد میں نے مناسب سمجھا کہ اس کی اشعار
سے پہلے اسے اپنے محترم اور شفیق کرم فرما جناب امتیاز علی صاحب
عرشی کو بھی دکھلاؤں۔ میری درخواست پر انھوں نے میرے مسوئے کو
بڑی توجہ اور کاوش سے پڑھا اور اس کے متعلق اپنے قیمتی مشوروں سے
بھی سرفراز فرمایا۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ عرشی صاحب نے میری خاطر جو زحمت اٹھائی
ہے اور ان کی جو نوازشیں میرے حال پر رہی ہیں ان کا شکریہ میں کس
زبان سے ادا کروں۔ محض رسمی شکریہ ادا کرنا تو چھوٹا سہجہ بڑی بات کے
مسدان ہو گا۔

کئی اشعار کے تحت میں نے جو تنقید لکھی ہے یا ان سے متعلق کوئی عام
بحث چھیڑی ہے اس کے بارے میں عرشی صاحب کا خیال تھا کہ مطاب
اشعار کے اسوایہ تمام باتیں کتاب کے دیباچے میں لکھی جائیں تو زیادہ مناسب
ہو گا۔ ان کا خیال بالکل درست تھا لیکن میرے لئے دشواری یہ تھی کہ میں نے
پوری کتاب اس انداز سے چار نگین کو پہنچائی ہے کہ ایک ایک شعر کو
لے کر اس پر گفتار لکھا ہوں اور بعد میں جب ان اشعار کی تعداد کافی ہو گئی
تو ان سب کو یکجا کر لیا ہے۔ اب اگر ہر تنقید یا بحث کو متعلقہ شعر سے
معلقہ کر کے پھر لکھوں تو قریب قریب پوری کتاب دوبارہ لکھنا

پڑ جائے گی۔ چونکہ کہنا ایک ہی بات تھی خواہ ایک طویل دیا ہے میں کہی
 چلے، خواہ مختلف اشعار کے ضمن میں جستہ جستہ، لہذا اس سلسلے میں،
 میں اپنے مسوے میں تبدیلی کرنے سے قاصر رہا ہوں۔ اپنی اس سہل
 انجاری کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

میں نے اگر بعض شارحین یا نقادان فن کی رائے سے اختلاف کیا
 ہے تو یہ محض ”سخن گسترانہ بات“ کی تعریف میں آتا ہے اور اس سے
 ”قطع محبت“ ہرگز مقصود نہیں ہے۔ میں ان میں سے ہر ایک کو قابلِ احترام
 سمجھتا ہوں اور ان کے بلند مرتبے اور کثرتِ سخن کا معترف ہوں۔

میری خواہش تھی کہ عرضی صاحب اس کتاب کا دیباچہ تحریر فرماتے
 لیکن انہوں نے اپنی صحت کی خرابی اور عدیمِ افریقی کے باعث ایک
 مختصر خط لکھنے پر اکتفا کی ہے۔ میں اسی کو شائع کر رہا ہوں۔

وجاہت علی سندیلوی

یکم سنی ۱۳۹۲ھ



نشاطِ غالب کے متعلق

جناب امتیازِ مسلی مرثی

کے

مکتوب

نام پور

۱۸ فروری ۱۹۶۴ء عزیز گرامی قدر سلامت باکرامت ہو

میں نے نشاطِ غالب کو سبھا سبھا پڑھا۔ آپ نے جس پیرِ نری اور کج کاوی

سے کام لیا ہے، وہ داد اور ستائش کی ستم ہے۔ شاباش، جزاک اشرا

غالب کے اشعار کے ساتھ دشمنوں ہی نے نہیں دوستوں نے بھی انصاف

نہیں کیا۔ چو کہ غالبؔ وہ دارِ شعر کہنے کے عادی تھے اس لئے اس کے خاصین نے

ہر شعر میں نہ نہیں تہ در نہ کی تلاش کی ہے اور بے اوقات ایسے ایسے نکتے ایجاد

اور اختراع فرمائے ہیں کہ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے!

آپ نے ان حضرات کی تشریح و توضیح پر نہایت عالمانہ اہانت سے غور کیا ہے اور جبکہ

مگر بعضا نہ محاکمہ بھی کیا ہے اور انہی بدگمانہ رائیں بھی صریح کی ہیں، میں کیا آپ خود بھی

یہ دعوے نہیں کر سکتے کہ جبکہ آپ نے سوچا ہے وہ حربہ آخر ہے لیکن یہ بات میں

بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ اکثر مقامات پر آپ کا انداز فکر غور و غوض کی دعوت

دیتا ہے اور یہ ثابت کردیتا ہے کہ ابھی اشعارِ غالب پر سوچنے کی کافی گنجائش موجود

ہیں والسلام

مخلص دماغ
عمرہ

نقش فریادی ہے کس کی شوخی / تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر سیکر تصویر کا

خود غالب نے اس شعر کی تشریح یوں کی ہے : ”ایران میں رسم ہے کہ دادخواہ کاغذ کے کپڑے پہن کھر جاگم کے سامنے جاتا ہے۔“ جیسے مشعل دن کو جلا نا، یا غنم آلودہ کپڑا بانس پر لٹکا کرے جاتا، بس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخی / تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورتِ تصویر ہے اس کا پیرہن کاغذی ہے۔ یعنی ہستی اگر یہ مثل اعتبار محض ہو، موجب رنج و ملال و آزار ہے۔“

یہ شعر غالب کے سب سے پہلے مجموعہ ”کلامِ (جو بعد میں نسخہ احمدیہ کے نام سے شائع ہوا) میں بھی شائع ہے، جس کی کتابت کے وقت غالب کی عمر ستر چوبیس سال کی تھی۔ ظاہر ہے کہ غالب اس عمر سے قبل یہ شعر کہہ چکے تھے۔ معنوی بلاغت کے علاوہ بڑے دلآویز اور مترنم الفاظ کے گلہ سنے کی حیثیت سے بھی یہ شعر عظیم المثال ہے۔ دیوان غالب کا یہ پہلا شعر ہے اور غالب کے زمانے میں رواج تھا کہ دیوان کی ابتدا حمد سے ہوتی تھی غالب نے حمد میں کوئی غزل کہنے کے بجائے صریحاً یہ ایک شعر کہا ہے اور وہ بھی اپنے منفرد انداز میں، جو حمد ہونے کے علاوہ شکوہ بھی ہے۔

طباطبائی صاحب کا اس شعر کے متعلق ارشاد ہے : ”کاغذی پیرہن پہننے کا رواج نہ کہیں دیکھا نہ کہیں سنا۔ جب تک اس شعر میں کوئی ایسا

لفظ نہ ہو جس سے فنا فی اللہ ہونے کا ثبوت اور ہستی اعتباری سے نفس صبر
ظاہر ہو، انھیں وقت تک اسے باطنی نہیں کہہ سکتے (نہیں معلوم کیوں؟)
مصنف کی یہ غرض تھی کہ نقشِ تصویر فریاد ی ہے ہستی بے اعتبار اور بے
توقیر کا اور یہی سبب ہے کاغذی پیراہن ہونے کا۔ شعر میں ہستی بے اعتبار
کی گنجائش نہ ہو سکی۔ اس سبب کے قافیہ مزاحم تھا اور مقصود تھا مطلع
اس لئے ہستی کے ہمے شوخی تحریر کہہ دیا، شعر بے معنی ہے ۛ

غائب کی شوخی فکر کے ساتھ طباطبائی صاحب کی شوخی فہم بھی
سے مستغنی ہے۔ ان کے علاوہ جتنے بھی غائب کے شارحین ہیں اور جن کی فہم
کافی طویل ہے انھوں نے اس شعر کو نہ صرف باطنی قرار دیا ہے بلکہ بیشتر
نے اسے حُسنِ تغیل اور زورِ بیان کا ایک شہ پارہ تسلیم کیا ہے۔ طباطبائی
صاحب کا یہ ارشاد کہ کاغذی پیراہن پہننے کا رواج نہ کہیں دیکھا اور نہ
کہیں سنا، اُن کا صنفِ ذاتی تجربہ ہے، ورنہ یہ ایران کا ایک بہت پُرانا
دستور تھا جس کا ذکر غالبؔ پیشتر بھی کئی فارسی شعرا اپنے کلام میں کر چکے
ہیں۔ طباطبائی صاحبؔ نے از خود شعر کے معنی پہلے تجویز کر لئے اور شعر پر بعد
میں غور کیا اور جب وہ ان معنوں پر پورا نہ اُترتا تو اسے بے معنی قرار دیا۔
بعض دیگر شارحین نے اس شعر کے معنی یوں بیان کئے ہیں:—

سعد

ۛ انسان کی بے ہوشی اور کشاکشِ حیات کا نقشہ الفاظ میں کھینچا گیا
ہے، مابل شعر کا یہ ہے کہ ہستی خواہ کسی چیز کی بھی ہو بامثل تکلیف و رنج

ہے جسے کہ تصویر تک بھی جو کہ میرسنٹر ایک سہتی محض ہے زبان حال دریا
 کمرہ ہی ہے کہ مجھ کو بہت کمر کے کیوں رنج ہستی میں جلا کیا بیسا کہ اس کی
 کاغذ پر ہمیں سے فہر ہے۔“
 اسی دسہا،

مولانا دہم نے اس مضمون کو ان اشعار میں ادا کیا ہے :-
 بشنوا نے چوں حکایت می کند وز بدایہا شکایت می کند
 گزشتاں تا مرا پیریدہ اند از نصیرم مردوزن تالیدہ اند
 مطلب یہ ہے کہ اصل سے جدا ہونے کے بعد منظر اری کیفیت پیدا ہو جانا
 ضروری ہے۔ اسی طرح جب تصویر کاغذ پر بنائی جاتی ہے تو وہ اپنے
 کاغذی لباس کی بدولت نقاش کی شوخی تخیل کی زبان حال سے
 فریاد کرنے لگتی ہے۔“
 بیخود دہلوی،

”ہر پیکر تصویر سے مراد جملہ حیوانات، جمادات اور نباتات کے ہے
 اور یہ ساری چیزیں فنا ہونے والی ہیں۔ جب موجودات عالم کا یہ حال
 ہو تو فطرت ہستی کا اپنی بے ثباتی پر فریاد می ہوتا شاعر کے تخیل بلند
 اور غریب معمولی جدت کا ثبوت کامل ہے۔“
 اثر لکھنوی،

”ہر شے زبان حال سے فریاد کر رہی ہے کہ لے ہائے پیدا کرنے والے
 لے مصور بے بدل اتوںے ہماری تخیل و تشکیل میں کیا کیا مستحکم و محکمیں

سرت کیں، لیکن کیا قیامت ہے کہ جو ہے دست برد فنا میں ہے، نہ قرار ہے نہ ثبات ہے، اگر مٹا نا تھا تو بننے میں اتنا اہتمام اتنا تکلف کیوں کیا؟
 نیاز فتحپوری،

اس نگار خانہ عالم کی ہر ہر چیز، نقاشیں ازل یعنی قدرت کے
 حضور میں زبان حال سے اپنی نا استواری و فنا پذیرگی کی فریاد کر رہی ہے
 پروفیسر سلیم حسینی،

غالب کا یہ شعر جو سرِ مطلع دیوان ہے ان کی شوخی فکر کا بلا شک شبہ
 آئینہ دار ہے۔ انہوں نے حمد کے پہلے میں خدا سے گلہ کیا ہے کہ ملے خدا !
 کہ جب تو نے ہر مخلوق کو فنا کے لئے پیدا کیا تو پیدا پن میں اس قدر کمال
 کا اظہار کیوں کیا ؟ بالفاظ دیگر جب ہمت کمر کے مٹا نا منظور تھا تو ہمت
 کرنا ہی کیا ضرور تھا۔ یہ تو ارد بھی کس قدر حیرت انگیز ہے کہ غالب کے
 جرم ہم عصر شوہن دار نے بھی ہستی سے متعلق یہی نظریہ پیش کیا ہے کہ ہستی
 سراپا کشکش، اذیت اور شر ہے۔ ہستی کی نہ میں ارادہ کار فرما ہے اور سارا
 فساد اسی کا پیدا کردہ ہے۔

اب میں اس شعر کے جو معنی سمجھا ہوں وہ عرض کرتا ہوں۔

نقش۔ صورت، ہر چیز جو عالم وجود میں آئے، ہستی۔ نگار خانہ عالم۔

فریادی۔ فریاد کرنے والا، پناہ مانگنے والا، مبتلائے غم۔

شوخی تحریر۔ نقش کی روحانی، تخلیق کی ستم ظریفی۔

کاغذی پیرہن۔ فریادی کا لباس، جو کہ کاغذ جلد پہنے جاتا ہے

لہذا کنا یہ ہے عدم ثبات سے۔

پیکر تصویر۔ تصویر کے نقش و نگار کوئی بھی چیز جو تصویر کی طرح دلاؤیز یا خوبصورت ہو۔ کنا یہ ہے مخلوق کا جو دظاہری سے۔

شاعر صبر کے چوچھتا ہے کہ یہ سارا نگار خانہ عالم کس کی امراد خدا سے ہے، تخلیق کی ستم ظریفی پر فریادیں بنا ہوا ہے؟ یہاں کی ہر چیز دلاؤیز بننے کے ساتھ ہی ساتھ مبتلائے غم اور بے ثبات بھی کیوں نظر آتی ہے؟ خدا کو جسے جگہ غم اور فنا آباد ہو جانا تھا تو اس نے زندگی اس قدر دلاؤیز بنایا ہی کیوں؟

غالب نے صرف لفظ ”نقش“ سے پورا نگار خانہ عالم مراد لیا ہے و نقش، کی رعایت کا تحریر کیا ہے جو تخلیق کے معنی ادا کرتا ہے۔ گویا یہ ساری کائنات خدا کی تحریر ہے۔ صرف لفظ شوخی سے یہ معنی پیدا کر دیے ہیں کہ تخلیق کا کرم بھی بڑا پُر ستم ہے۔ کاغذی پیرہن سے نہ صرف مبتلائے غم ہونا بلکہ بے ثبات ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک لفظ تصویر سے تخلیق کا حسن اور کمال ظاہر کر دیا ہے، خوبصورت اور کارگیری کو نمایاں کرنے والی چیز کو تصویر سے تشبیہ دی جاتی ہے، انگریزی کا ایک عام محاورہ ہے ”تصویر کی طرح خوبصورت“ تصویر عام طور سے کاغذ پر بنائی جاتی ہے لہذا کاغذی پیرہن میں یہ رعایت بھی ملحوظ رکھی گئی ہے۔ غرض کہ اس شعر کا ہر لفظ ایک گنجیدہ معنی ہے جو دوسرے لفظ کو زور پہونچا رہا ہے۔ الفاظ کم سے کم اور معنی نہ صرف زیادہ سے زیادہ بلکہ لطیف سے لطیف تر، اسی کو قادر الکلامی کا اعجاز کہتے ہیں جو ادب کے نگار خانے میں غیر ثباتی نقوش خبث کر جاتا ہے۔

آج واں تیغ و کفن بانٹے ہوئے جاتا ہوں ہیں
عُذر میرے قتل کمرنے میں وہ اب لمبے گے کیا؟

غالب کے اس شعر کے متعلق بعض اربابِ نقد نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ
عرفی کے مندرجہ ذیل شعر کی عکاسی کرتا ہے یہ

سہم آں سیرِ دہاں گشتہ کہ با تیغ و کفن +

تا درِ خاندِ حبلاً د غزلِ خواں رفتہ

حضرت آگس (فریضی) نام ایک صاحب کا جنھوں نے ماہنامہ نگار
لکھنؤ میں غالب بے نقاب کے عنوان سے ایک مضمون یہ ثابت کرنا کٹے
لکھا تھا کہ غالب کے ہفتے اشار میں فارسی اساتذہ کے اشار کا عکس
نظر آتا ہے) کا کہنا ہے ”عرفی کے یہاں غزلِ خواں رفتہ والا کلمہ اس قیاس
کا ہے کہ جواب ہی نہیں یہ ثابت ان کے کہنے کا مقصود یہ ہے کہ غالب نے
عرفی کے پا مال مضمون پر قلم بھی اٹھایا تو اس کو اس لطافت کا نچھان سکے جو
عرفی کا حصہ تھا مطلب یہ کہ ایک تو نقل کی اور پھر وہ بھی ایسی کہ وہ اس
کو صرف مُنہ چڑھاتی رہ گئی۔

علامہ مجذوب دہانی نے اس کا جواب اپنی کتاب گنجینہ تحقیق میں یوں
دیا ہے ”ما شیخ اپنے دل میں غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ میں نے
اب تک جان سے ہاتھ دھو بیٹھنے والوں کی صورت ہی نہیں بنائی اور
بھی سبب یہ کہ وہ (میر) مشوق کسی نہ کسی بہانے مجھے ٹال دیا کرتا ہے۔

آج اس ساز و سامان سے جاتا ہوں (یعنی کفن اور تلوار لے کر) اب تو کوئی
 عذر ہو ہی نہیں سکتا۔ اس شعر سے معلوم ہو رہا ہے کہ عاشق معشوق کے
 ہاتھ سے قتل ہونے ہی کو مال زندگی سمجھتا ہے۔ عرانی کے شعر میں جب تک
 ”سیر ز جاں گشتہ“ لکھو اس وجود ہے اس وقت تک غزل خواں دہنم کے ہوتے
 ہوئے بھی وہ غالب کے شعر کی گرد کو نہیں پہونچ سکتا۔ اس لیے کہ جان
 سے بزار ہونے پر مرنے کی خوشی اور چیز ہے اور معشوق کے ہاتھوں قتل
 ہو جانے کی تدبیر مجھ میں آنے پر ٹھوہلوں نہ سانا اور چیز ہے یہ

مجھے ان دونوں مقابل اشارے کے متعلق عرض یہ کرنا ہے کہ ان کا مضمون
 بہت عام تھا اور وہ ہے جس میں کوئی خاص نکتہ نہیں ہے۔ غالب اور عرانی
 کے علاوہ بھی بہت سے دوسرے شعرا نے اس پر طبع آزمائی کی ہے۔ اس
 نوعیت کے اشعار میں صنف مختلف شعر کا انداز بیان قابل غور ہوا کرتا
 ہے جس سے ان کے مجموعی تاثر میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو جاتا
 ہے۔ لہذا صنف مضمون شعر پر سرتہ یا قوار کا الزام لگادینا بڑی زیادتی ہے
 کیونکہ اس نظر سے دیکھا جائے تو ہیں اپنی شاعری کا بیشتر سرمایہ دریا برد
 کر دینا پڑے گا۔ زندگی میں کوئی چیز نئی نہیں ہے صرف اس نئے پیش
 کئے جانے کے انداز ہی نئے ہو سکتے ہیں۔

مجھے بخیر دوسو ہانی صاحب ہے اس بات پر اتفاق نہیں ہے کہ عرانی کا
 شعر غالب کے شعر کی گرد کو بھی نہیں پہونچتا۔ میری گزارش یہ ہے کہ دو نیا
 شعرا نے ایک ہی مضمون کے بالکل جہا جہا پہلوؤں پر زور دیا ہے۔ البتہ

یہ بات ضرور ہے کہ غائب جس بات پر زور دیا ہے وہ مقابلہ زیادہ
 دل پذیر اور فکر انگیز ہے اور اس سے ایک ڈرامائی تجسس پیدا ہو گیا
 ہے۔ عمر کی جو کچھ کہنے کی کوشش کی تھی اُسے اپنے اٹھارہ بیان سے
 یقیناً حد کمال کو پہنچا دیا ہے۔

عمر کی مرنے کی خوشی اور اشتیاق غماہ کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے

تا دُرُخاۃ حبلا دُخولِ خواں رستم

ہست خوب کہا ہے۔ سیرِ زباں گشتہ اس کے معنی جھوڑ سوانی صاحب نے جان
 سے بیزار ہونا مراد لئے ہیں، حالانکہ اس کے معنی زندگی سے دل بھر جانا
 یا آسودہ ہو جانا بھی ہو سکتے ہیں، جس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ صرف
 زندگی سے نفرت ہی کی وجہ سے ہو۔

غائب کے شعر میں معرکہ الکراما کھڑا۔

مذریعہ قتل کرنے میں وہ اب لالہیں گے کیا

ہے۔ آج کے لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ معشوق کے دن قتل نہ کرنے کا
 کوئی ذکوئی بہا ذکر دیا کرتا۔ کبھی کہتا کہوار نہیں ہے، کبھی کہتا تھا رے
 کفن کا انتظام کون کرے گا وغیرہ وغیرہ۔ شاعران سب مذرا کے متعلق
 جو معشوق اب تک کرتا ملا آ یا تھا، پیش بندی کر کے ہر طرح سے تیار ہو جاتا
 ہے۔ پھر اپنے آپ کو یاد دہانے والوں سے پوچھتا ہے کہ کوئی بات رہ گئی ہو
 تو بتاؤ۔ اب اس تیاری کے بعد دیکھیں معشوق قتل نہ کرنے کا کون سا
 بہانہ ڈھونڈتا ہے۔ قاعدے سے قواب کوئی بات رہ نہیں گئی ہے۔

شعر کا پڑھنے والا کئی باتیں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کیا عاشق
 آج قتل ہو جائے گا؟ کیا آج بھی معشوق اس کے قتل نہ کرنے کا کوئی
 بہانہ ڈھونڈھے گا؟ کیا معشوق کا عذر صحیح ہوگا؟ کیا وہ عاشق کو اس
 سے محبت یا اپنی ایذا پسندی کی وجہ سے قتل ہی نہیں کرنا چاہتا؟ وغیرہ۔
 عرقی کا شعر میراث ایک خاص کیفیت بیان کرتا ہے اور خوب
 بیان کرتا ہے۔ غالب کا شعر ایک مسئلہ یا صورت حال پیش کرتا ہے جو
 کئی پہلوؤں کی حامل ہے۔ غالب قابل ملامت نہیں قابل تائید
 ہیں کہ انہوں نے عرقی کے مضمون پر طبع آزمائی کی تو ایسی کہ خود عرقی
 کے لئے قابل رشک بن گئے۔

عرقی کے مضمون سے بجائے شعر مندرجہ بالا کے غالب کا یہ شعر
 زیادہ قریب ہے۔

مفتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے

پُگل، خیالِ دھنم سے دامن نگاہ کا

اس میں عرقی کا سیر زجاں گشتہ کا قابل اعتراض (بقول حضرت بختیار

موبانی) مفہوم موجود نہیں ہے۔ اس میں غالب نے ایک بالکل ہی دوسری

کیفیت پیدا کر دی ہے۔ عرقی کا غزل خواں رنم کا کھڑا جس کے متعلق حضرت

آرگس کا ارشاد ہے کہ "اس قیامت کا ہے کہ جواب ہی نہیں" غالب کے اس شہ پار

کہ خیالِ دھنم سے نگاہ کا دامن پُگل ہے (پہلوؤں سے بھرا ہے) کے مقابلے میں

بالکل رد کہا جیسا معلوم ہوتا ہے۔

تھے وعدے پر جے ہم تو یہ جان، جھوٹا

کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعمت بار ہوتا

غالب کے بعض نکتہ چینیوں نے ان پر یہ الزام لگانے کی کوشش کی ہے کہ ان کے کچھ اشارے ایسے بھی ہیں کہ جن کا مرکزی خیال بعض مشہور فارسی شعرا کے اشارے سے لیا گیا ہے۔ کچھ حضرات نے الزام تو نہیں لگایا ہے البتہ اپنے مطالعہ کی وسعت ظاہر کرتے ہوئے غالب کے چند اشعار کے متعلق صرف اس اشارے پر اکتفا کی ہے کہ اسی بات کو فلاں فارسی شاعر نے یوں کہا ہے اور خوب کہلے ہے۔ کسی شاعر کے کلام کا دوسرا شاعر سے موازنہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ سوزنہ اور مقابلہ سخن نفسی اور نکتہ سنجی کے واسطے ایک امر لازم ہے اور بغیر اس کے ارباب ذوق پر کسی شاعر کے حقیقی جوہر آشکار ہی نہیں ہو سکتے۔ لیکن اگر اس اشارے سے درپردہ یہ بتانا مقصود ہو کہ غالب نے کسی شعر کا مرکزی خیال کسی دوسرے شعر سے لیا ہے تو یہ اشارہ بھی یقیناً ایک اعتراض کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

مجھے اس الزام یا اعتراض کی بنیاد ہی سے اخلت ہے، شاعر موجد ہوتا یا حرت اول کہنے کا دھوپا نہیں ہوتا، وہ بیشتر عامۃ الورد و باتیں کہتا ہے البتہ اس کے کہنے کا انداز اور اسلوب جداگانہ ہوتا ہے، اور اس کو زیادہ پُر تاخیر اور زود و اثر بنانے کے لئے وہ تشبیہات، استعارات، تلمیحات اور محاوروں کے برجستہ استعمال وغیرہ کی مدد سے اپنی صفت طبع اور

پرواز تخیل کے جوہر دکھاتا ہے۔ اس کے لئے یہ قید لگانا کہ وہ کوئی ایسی
 بات نظم ہی نہ کرے کہ جس کا مرکزی خیال کوئی دوسرا شاعر اس سے
 پہلے نظم کر چکا ہو، اس کے لئے ایک ناممکن اکتھول معیار قائم کرنا ہے۔
 معشوق خوبصورت ہے، اس کی ہر ادا اول ربا اور ایاں مشکین ہے
 معشوق بے وفا ہے، بے رحم ہے اور عاشق کو اذیتیں پہونچاتا ہے۔
 عاشق با وفا ہے، معشوق پر اپنی جان فدا کرنے کے لئے تیار ہے، اس کے
 ہجر میں انگاروں پر لوٹتا رہتا ہے۔ زمانہ نا قدر فنا سے ہے۔ دوست
 در پہ آزار رہتے ہیں۔ عاشق بے کس اور مظلوم ہے۔ معشوق کے بغیر
 ساری دنیا سے بیزار ہے، اپنی موت کو ہر وقت پکارتا رہتا ہے
 مفلس ہے لیکن شراب پینے کا بے حد شائق ہے۔ گنہگار ہے لیکن رحمت
 پروردگار سے اپنی بخشش کی توقع رکھتا ہے۔ ہر چیز میں ذات خداوند
 کا جلوہ ہے۔ موت برحق ہے، زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ راہِ پناہ
 ہے۔ رقیب کینہ پرور ہے، ناصح یا دہ گو ہے وغیرہ وغیرہ۔ اگر ان صفات
 چند باتوں کو مرکزی خیالات مان لے جائیں تو اردو شاعری کے کچھ
 نہیں تو پچھتر فیصدی اشعار میں ان کی بھرپور پرچائیاں ملیں گی۔ کیا
 شیر اور سودا، کیا ذوق اور موتیں، کیا تاجخ اور آتش۔ اور بعد کے غزل گو
 شعرا کا تو ذکر ہی کیا، سب اسی گزرت میں آ جائیں گے کہ ان کے کلام کا
 مستند حصہ ایسا ہے کہ جس کے مرکزی خیالات کو ان سے پیشتر کے شعرا
 کہہ چکے ہیں۔ اور زیادہ سختیں اور بخششیں سے کام لیا جائے تو پیشتر کے

شمرانے بھی مرکزی خیالات اپنے جن پیشرو ہزرگوں سے لئے ہوں گے
ان کی بھی نشان دہی کی جا سکتی ہے اور بالآخر بات دہاں تک
پہنچ سکتی ہے جب پہلے مرد نے پہلی عورت کا انہار محبت کیا ہو گا۔
غالب کی یہ نفسی ہی نہیں بلکہ خوش نفسی ہی ہے، یہ ان کے کلام کا ججز
نہیں بلکہ افتخار ہے کہ ان کے متقدمین اور دوستوں کے معاصرین کے کلام کو
ان کے کلام کے مقابلے میں اتنا قابل اعتنا ہی نہیں سمجھا گیا کہ اس کے متعلق
بھی اس قسم کی کوئی تحقیقات کی جاتی کہ اس کے مرکزی خیالات کو کہاں
کہاں سے لیا گیا ہے۔ قرطی قال بنام من و یوانہ زودند کے مصداق یہ شرف
صرف انہیں کو حاصل ہوا کہ ان کے کلام کو ارباب ذوق نے نہ صرف
عینک سے بلکہ خورد و ہر سے دیکھنے کی ضرورت سمجھی اور اس کے بعد بھی
نتیجہ صرف یہ نکلا کہ ان کے ہزاروں متداول اور غیر متداول اشار میں
سے مشکل سے صرف پچاس ساٹھ کے متعلق یہ اشارہ کرنے کی ہمت کی جا سکی
کہ ان کے مرکزی خیالات کو کسی دوسری جگہ سے لیا گیا ہے۔ کچھ پر چھٹے تو
اس کوئی پرکسے جانے کے بعد غالب کی عظمت کو اور ہمارے چاند لگ جاتے
ہیں۔ دوسرے شعر لے کر اس قسم کے امتحان میں جیتا کیا جائے تو نہیں
معلوم اُن کا کیا حشر ہو۔

دانش ہے کہ میرے یہ معروضات عامۃً انور و مومنوعات سخن کے
متعلق ہیں۔ میں اس حقیقت سے بیگانہ نہیں ہوں کہ اگر کسی شاعر نے کوئی
نئی اور اچھوتی بات کہی ہو یا کسی خاص انداز بیان یا انداز تخیل کا انہار کیا

ہو اور کوئی دوسرا شاعر اس کی نقل کرنے اور سرقہ ظاہر یا سرقہ غیر ظاہر کا مرتکب ہو تو وہ یقیناً سرقہ نشی کا مستحق ہے۔ غائب کا کلام ان میوب سے پاک ہے۔ الزام لگانے والوں نے ان کے دو ہزار اشعار کے متعلق سرقہ کا بھی الزام لگایا، لیکن ان لوگوں نے اس بات پر بھی غور نہیں کیا کہ اگر کسی مقابلہ پرست مضمون کو بلند کر دیا جائے تو وہ سرقے کی تعریف میں نہیں آتا۔ نقل اصل سے بڑھ جائے تو اس کی اپنی ایک علیحدہ حیثیت قائم ہو جاتی ہے۔

ماہنامہ تجرک لکھنؤ کے فروری ۱۹۷۷ء کے شمارے میں "غائب بے نقاب" کے عنوان سے ایک مضمون میں ایک صاحب نے جو گنام و ہنار پرین مصلحت سمجھتے تھے "آرگس" کے فرضی نام سے غائب کے بعض اشعار کو مقدمہ کے اشعار کی عکاسی یا خوشہ چینی کرنے کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اس کے جواب میں حضرت تجرک دہلوی نے ایک بڑا بڑا مضمر اور بصیرت افروز مضمون "آرگس بے حجاب بجا اب غالب بے نقاب" لکھا تھا جو اسی زمانے میں نیرنگ خیال لاہور، اور جام جہاں ٹاٹا لکھنؤ میں شائع ہوا تھا۔ اور اب مصنف کی کتاب گنجینہ تحقیق میں شامل ہے۔ اس مضمون میں حضرت تجرک دہلوی نے حضرات آرگس کے الزامات اور اعتراضات کو نہ صرف بالکل بوجھ اور باطل بلکہ مدلل بحث اور تحقیق سے یہ بھی ظاہر کر دیا تھا کہ حضرت آرگس غالب کے جن اشعار کو مقدمہ میں کے جن اشعار کا عکس بتاتے ہیں ان کے بیشتر مقابلے پر صحیح مطالب سمجھنے ہی سے وہ قاصر رہے تھے اور دراصل مقابل اشعار کے

در بیان بہت بڑا اور واضح فرق موجود تھا۔

دیادہ تردیکھنے میں بھی آیا ہے کہ سرقد یا بنیادی خیال کی عکاسی کا الزام لگانے والے حضرات محض چند الفاظ کی یکسانیت یا صرف ایک مددیک خیال کی مطابقت دیکھ کر باتیں اڑتے ہیں اور یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ دو بظاہر مقابل اشعار کا مجموعی تاثر ایک دوسرے سے کتنا مختلف ہے۔ حضرت اگر گس نے غالب کے جن اشعار کے متعلق سرقد کا الزام لگایا ہے ان میں سے اکثر نہیں بشرطہ ایسے ہیں جن کو اپنے مفروضہ اصل سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ مثال کے طور پر صرف مہند اشعار ملاحظہ ہوں کہ کس طرح صرف غالب کو بدنام کرنے کے لئے کیسی کیسی دُر کی کوٹیاں لائی گئی تھیں۔

غالب، میں نے چاہا تھا کہ اندوہ و قاسے چھوڑوں
وہ سنگ مر مرے مرنے پہ بھی راہنما نہ ہوا
رما کی شیرازی خواستم آتشیں دل را بنشانم بہ سرشک
آن قدر ہم جگر سوختہ ام، آب نداشت
غالب، کی مرے قتل کے بعد اُس نے جن سے توبہ
ہائے اُس زود پشیمان کا پشیمان ہونا
حافظ، آفریں بد دل نرم تو کہ از ہر ثواب
کشتہ و خنجر خود را بہ نسا ز آرد
غالب، یارب وہ نہ بجھے ہیں نہ بچیں گے مری بات
مے اور دل اُن کو جو نہ مے بھگتوں اور

(خسرو) زبان شوخ من ترکی و من ترکی نے دانم
 چہ خوش بودے اگر بودے زبانش درد زبان ما
 (غالب) و ناداری بشرط استواری اہل ایماں سے
 مڑے بُت فانا میں تو کعبہ میں گاؤں برہمن کو
 (عرفی) بے کیش برہمن ایں کس از شہیدان ست
 کہ در ہبادت بت ردے بر زمین میرد
 اب بات چھڑ گئی ہے تو چند وہ اشعار بھی سنئے چلے جن کے مقلد
 حضرت آؤ گھنوی کا خیال ہے کہ ان کو غالب نے سترے مٹا کر
 ہر کر کہا ہے۔

(غالب) دُعا کچھ تو مذا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
 ڈبڈبایا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
 (میر) ہری نمود نے مجھ کو کیا برابر خاک
 میں نقشیں پاکی طرح پا کمال اپنا ہوں
 (غالب) لطافت ہے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
 چمن رنگار ہے آئینہ باد بہاری کا
 (میر) آدم خاکی سے عالم کو حبلا ہے درد
 آئینہ تھا تو مگر تابل دیدار نہ تھا
 دُخیل و دُخیل

زیب عنوان شعر ہے

تو دعدے پر مجھے ہم تو یہ جان بھوٹ جانا
 کہ خوشی سے مرنا جائے اگر امتحان ہوتا
 امتحانات شعر ہے کسی تشریح کا محتاج نہیں لیکن میں نے اس کا
 انتخاب صرف اس بات کو دکھانے کے لئے کیا ہے کہ وہ اشعار بھی جو
 ایک ہی موضوع پر ہیں اور جن میں بظاہر خیال کی بڑی یکسانیت معلوم
 ہوتی ہے دراصل جداگانہ مسنویت کے حامل ہوتے ہیں اور پڑھنے والے
 پر متحدہ طلحہ تاخر چھوڑتے ہیں۔ اس شعر کے مقابل میں مینلی کا یہ شعر
 پیش کر کے ہے

بیم از دستا مار، پرہ دعدہ کہ من
 از ذوق دعدہ تو بہ شرد انہی رسم
 حضرت اگر گس نے فرمایا ہے : مینلی نے کہا تھا کہ تو دعدہ کو اور
 ایسا دعدہ کا خیال ہی ذکر، اور تو نے دعدہ کیا اور خوشی سے
 ہمارا دم بکلا۔ بالکل ہی خیال غالب کے یہاں ہے۔ مگر مینلی کے یہاں
 قبل دعدہ ہے اور یہاں بعد دعدہ ۵

حضرت تہانے اس کا جواب یوں دیا ہے : نیشاپوری دعدہ کے
 ذوق میں مر جانے کا یقین دلا کر محبوب کے حمد و بیان لینا چاہتا ہے۔
 غالب مدق و کذب دعدہ کا ایک اچھا تمسار پیش کرتا ہے۔ اعلیٰ
 معنوں مستزاد ہماں۔ غالب کا حسن بیان شعر کو نیشاپوری کے شعر سے
 بلند تر کئے ہوئے ہے ۶

حضرت حمزہ مودودی کا ارشاد ہے : میری رسلے میں حضرت آدگس کا خیال صحیح ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ دونوں خیال یکساں ہی نہیں، بلکہ ایک ہیں۔ حضرت سہا جس کو اچھوتا سیار قرار دیتے ہیں وہ بالکل اسی طرح بلکہ اس سے کہیں بہتر صورت میں مٹی کے یہاں پایا جاتا ہے مگر یہ مضمون عام ہے اس لئے کہ انتہائی خوشی میں مرجانا مشہورات میں سے ہے جس پر شادی مرگ کی شہرت شاہد عادل ہے۔ پھر وعدہ وصل یار کی خوشی میں مرجانا کون سی بڑی بات تھکا کہ اس لئے اسے نہ ترجمہ کیے نہ سرقہ، یہ تو ارد کہا جاسکتا ہے۔ میرے نزدیک مٹی کا شعر نزاکت و بلندی خیال کے اعتبار سے مرزا فاطمہ کے شعر سے کہیں بالاتر ہے اس لئے کہ کہاں وعدہ یار کی خوشی میں مرد جانے کی معذرت کرنے کے لئے زندہ رہنا اور کہاں قبل وعدہ، وعدہ وصل کی خوشی میں مرجانے کا یقین ہوتا؟

میری مودود باذکر ارشاد ہے کہ یہ شعر تو ارد کی تعریف میں ہرگز نہیں آتا۔ دونوں میں بالکل جداگانہ بات کہی گئی ہے اور دونوں کے مجموعی تاثر میں بڑا فرق ہے۔ اب یہ بالکل دوسری بات تھکا کہ بعض ارباب ذوق کی نظر میں مٹی نیشا پوری کا شعر زیادہ بہتر ہو۔ یہ دعوئے کسی نے کیا ہے ذکر سکتا ہے کہ غالب نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اس میں وہ سب شاعرانہ سے بازی لے گئے، بلندی کے ساتھ پستی ان کے یہاں بھی ہے، البتہ یہ بات ضرور ہے کہ مقابلہ ان کے اچھے اشعار بہت زیادہ ہیں، اور ان میں بھی جو بہت اچھے ہیں وہ لا جواب ہیں اور انھوں نے دنیا کے ادب

ہیں ایک غیر فانی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ان کے مسولی اشار کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے لیکن ان سے ان کے مرتبے اور درجے کو کوئی صدمہ نہیں ہو پختا۔ ایسے بہت اشار کی تعداد کہ جو ان کے ظاہر میں انشان نہیں کئے جاسکتے بہت ہی کم ہے۔ میرا پتا چلایا ہے کہ بہت اشار کی جتنی تعداد تیرا، سودا۔ ذات اور سوسن جیسے عظیم المرتبت شر کی پہاڑ ساٹھ غزلوں میں بچل آئیں گے اتنے غالب کے پورے دیوان میں بھی نہیں چلیں گے۔

شعر زیر بحث کا مطلب حضرت آسمی نے یوں بیان کیا ہے :- ہم شکر وعدہ کرنے سے جتنے تو تونے یہ سمجھ کر جھوٹ جانا کہ اگر ہمارے وعدہ کا اعتبار ہوتا تو تجھے شادی مرگ ہو جاتی۔

حضرت نظم جیالائی نے اس شعر کی یوں تشریح کی ہے :- ہم نے جو یہ کہا کہ خطہ وعدہ وصل کن کریم مرنے سے نکال گئے تو تم نے جھوٹ جانا :- اس شعر میں 'جان' کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ 'بیمہ' اور دوسرے یہ کہ محبوب کو پیار سے مخاطب کیا ہے۔ اور اس طرح 'تو یہ جان جھوٹ جانا' کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں۔

(۱) تو اے جان! تونے اسے جھوٹ سمجھا کہ ہم تیرے وعدے کے سہلے بھارے ہیں۔

(۲) تو سمجھ لے کہ ہم نے تیرے وعدے کو سچا نہیں سمجھا۔

(۳) ہمیں اپنی اس خوش قسمتی پر یقین نہیں آیا کہ تو ہم سے وعدہ

کرے گا۔

اس شعر کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے جیسا کہ حضرت آسی، نظم مہلبائی اور بہت سے دیگر شارحین نے مختصر اُبیان کیا ہے یعنی ہم اپنی زندگی سے عاجز آ کر مرنے کی شان چکے تھے لیکن جب تو نے وعدہ کر لیا تو ہم اس کے ایذا ہونے کی امید ہو ہم کے سہارے جیتے رہے ہیں لیکن تو اسے جھوٹ سمجھتا ہے اور بھالے اس کے کہ ہمارے اس بھروسے کی قدر کرے اور اس بنا پر اپنے وعدے کو ایفا کرنے کی کوشش کرے تو اُنٹا ہمیں یہ طعنہ دیتا ہے کہ تمہیں میرے وعدے کا اعتبار ہی نہ تھا ورنہ تمہیں شادی مرگ ہو جانا چاہئے تھا۔ ماکمل کلام یہ کہ معشون کی بات کا اعتبار کرو تو مشکل اور نہ کرو تو مشکل۔ اس کی ناراضگی دونوں ہی صورتوں میں قائم رہتی ہے۔ یہ جز استغناء ہے، کہ خوشی سے مرنے جاتے اگر اعتبار ہوتا، خوشی ہے سازشگی اور ساتھ ہی ساتھ بڑی مصومیت کا حامل ہے۔ اس سے یہ پہلو بھی نکلتا ہے کہ معشون کو ہمارے عشق پر اعتبار ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اگر ہم اس کے کسی وعدے کو سمجھا سمجھ لیں۔ گے تو ہمارے خوشی کے مرجائیں گے۔

ان مطالب کے پیش نظر اس شعر کو مکی کے شعر سے کوئی مناسبت نہیں رہتی، سوائے اس کے کہ ان دونوں ہی اشعار میں وعدے اور اس کی طوفی میں مرنے کا ذکر آیا ہے۔ دونوں کا پس منظر بالکل مختلف ہے۔

شعر کا دوسرا مطلب جیسا کہ حضرت تہا اگر گس اور حضرت بخار و موبائی اور بعض دوسرے شارحین نے سمجھا ہے یہ ہو گا کہ تیرے وعدہ و صل

کے بعد ہی اگر ہم جیتے ہے تو مجھے کہ ہم نے تیرے وعدے کو، سچا ہی نہیں
 سمجھا تھا کیونکہ اگر سچا سمجھا ہوتا تو کیا ہم مائے خوشی کے مر نہ چکے ہوتے؟
 حاصل کلام یہ کہ اگر ہم کو تیرے وعدے پر اعتبار آجائے تو ہم کو شادی مرگ
 ہو جائے۔ ہم زندہ ہیں تو صرف اس وجہ سے کہ ہم کو اس کا یا اپنی ایسی
 خوش قسمتی کا کہ تو ہم سے وعدہ کر کے پھر اس کو ایفا بھی کرے گا اعتبار ہی نہیں ہے
 میلی کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ تو ایفائے وعدہ کا خوف نہ کر اور
 صرف مجھ سے وعدہ کرے کیونکہ تیرے وعدے کی خوشیا کے مارے ۔
 زندہ ہی نہیں رہوں گا۔

اس شعر میں یہ ٹکڑا کہ از ذوق وعدہ تو بغیر دانی رسم، میسنی
 تیرے وعدے کی خوشی چھین لیا، زندہ ہی نہ بچوں گا، واقعی داد سے مستغنی
 اور لا جواب ہے۔ شاعر کا وعدے کے متعلق حش طلب بہت خوب ہے۔
 اس نے ایک ایسی صورت معشوق کے سامنے رکھ دی ہے کہ اب اس کے
 لئے وعدہ نہ کرنے کا کوئی جواز ہی باقی نہیں رہتا۔ ایک پُر لطف پہلو یہ
 بھی نکلتا ہے کہ اب اگر معشوق وعدہ کرنے سے انکار کرتا ہے تو در پردہ
 اس کے یہ سنی ہوتے ہیں کہ اُسے عاشق کی زندگی پیاری ہے جو خود اس کی
 محبت کا ثبوت ہو جاتا ہے، لہذا وعدہ کر لینا اس کے لئے ناگزیر سا ہو جاتا
 ہے۔ دوسری طرف عاشق کا دُور ذوق و شوق اس انتہائی درجے
 پر ہے کہ اُسے یقین کا طے ہے کہ صرف معشوق کے ٹھہر وعدہ وصل کا
 اقرار سننے ہی وہ مائے خوشی کے مرجائے گا۔

شاعر نے حاضری بڑی عمدت طبع دکھائی ہے، لیکن اس کو شش میں وہ بعض ضروری قیود کو نظر انداز کر گیا ہے، چنانچہ یہ شعر کسی شاعر سے میرا ہے پناہ داد مائل کر سکتا ہے کیونکہ اس میں ایک بڑی چلتی پھرتی بات کہی گئی ہے، لیکن مخصوص ملکہ ادب میں تنقید کی کسوٹی پر پورا نہیں اُتر سکتا اور اس کے متعلق کئی بنیادی اعتراضات کئے جاسکتے ہیں۔

(۱) شاعر در پردہ نہیں بلکہ صاف صاف معشوق کو اکسار رہا ہے کہ مجھ سے جھوٹا ہی وعدہ کرے۔ بیچ بیم از دقا مدار..... تو کیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ مجھ سے جھوٹا وعدہ محض مجھے بہلانے کے لئے کیا جا رہا ہے شاعر کو شادی مرگ ہو جائے گی؟ یہ تو کوفت یا شرم سے مرنے کا مقام ہوا نہ کہ مالے خوشی کے۔ اور اگر معشوق کے اس نفرت آمیز سلوک کے بعد بھی شاعر کو مالے خوشی کے موت آجاتی ہے تو آپ کو اس کی جان نظاری سے زیادہ اُس کی خود فریبی اور سادہ لوحی کی داد دینا پڑے گی۔

(۲) 'بیم از دقا مدار' کہہ کر عاشق اگر معشوق سے وعدہ کر رہا ہے تو اس کے صرف یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ اُسے معشوق کے وعدے کی قدر و قیمت کا کوئی اندازہ ہی نہیں۔ وہ تو محض اپنے مرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا ہے۔ وہ مرنے کے لئے ایسا اُدھار کھائے بیٹھا ہے کہ اس کے دل میں معشوق کے وعدے کے ایٹا کئے جانے کی بھی نہ صرف کوئی امتیاز اور خواہش باقی نہیں ہے بلکہ وہ اُسے سرِ بچا غیر ضروری سمجھتا ہے۔

(۳) اگر شعر کو اور نازک معنوں میں لیا جائے یعنی تیرے وعدہ و

کے اقرار کی ادا پر سرباؤں گا تو غالباً وہ شعر اس سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر
 ہو گا جس میں صرف معشوق کی ایک جھلک دکھانے کی خوشی میں مرجانے
 کا تذکرہ کیا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کس قدر مضحکہ انگیز ہو گا۔

غالب کے شعر کے پہلے معنی تو خیر بالکل ہی مختلف ہیں۔ دوسرے
 معنی بھی کم سے کم ان اعتراضات کا پاک ہیں جو سبکی کے شعر پر کئے
 جاسکتے ہیں۔ حضرت تجوید موبائی کا یہ فرمانا کہ غالب کے شعر میں معشوق
 کے وعدہ کر لینے کے بعد بھی زندہ رہنے کی معذرت خواہی ہے، بالکل درست
 ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس سے عاشق کی خود داری کا بھی ایک نایاب
 پہلو نکلتا ہے۔ معنی وہ معشوق کے کسی جھوٹے وعدے پر مرنے کے لئے تیار
 نہیں ہے۔ غالب کا عاشق بالکل ریشہ خطمی قسم کا انسان نہیں ہے بلکہ
 اس کی بھی اپنی غیرت نفس ہے۔ دراصل غالب کا شعر ذریعہ بحث جس میں
 انہوں نے معشوق کے وعدے کو جھوٹ سمجھا ہے، اپنے زمانے کی
 روایتی عاشقی سے ایک علیحدہ چیز ہے۔ معشوق کے جھوٹے وعدوں
 کے سلسلے میں ایک جگہ اور کہا ہے اور بہت خوب کہا ہے یہ

سادہ پرکار ہیں خواباں غالب

ہم سے چہاں و سنا باز سننے ہیں؟

ہر کیف غالب کا شعر تیلی کے شعر کا نہ خوشہ ہیں ہے اور
 نہ عکاس۔ غالب نے اپنی ایک الگ بات کہی ہے۔ وہ کہی ہوئی
 بات جان بوجھ کر کہتے تو پھر دب کر نہ کہتے۔ شاعرانہ مبالغے میں

بھی (جو اکثر ان کے قدر دانوں کو بھی گراں گزر جاتا ہے) وہ اپنا
جواب نہیں رکھتے تھے۔

دعویٰ کے موضوع پر غالب کا ایک دوسرا شعر ملاحظہ ہو۔

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ مجھ راہنی کہ کبھی

گوشِ منت کشیں گھاہنگِ تسلی نہ ہوا



کیا وہ نمرود کی خدائی تھی

بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

مولانا حالی نے اس شعر کے معنی یوں لکھے ہیں: میری بندگی کیا نمرود کی خدائی تھی کہ اس سے مجھ کو سولے نقصان کے کوئی فائدہ نہ ہو چکا..... بندگی پر نمرود کی خدائی کا اعلان کرنا بالکل نئی بات ہے۔
 تہا اور آتھی صاحبان نے اس شعر کا مطلب یوں بیان کیا ہے
 ”خدا جس کی میرا نے عبادت کی کیا وہ نمرود تھا، اور اُس کی خدائی نمرود کی خدائی تھی کہ اس میں میری بندگی سے میرا بھلا نہ ہوا۔“

شعر کے الفاظ سے تہا اور آتھی صاحبان کے معنی بھی درست ہو سکتے ہیں، یعنی شاعر بہت جلد کر خدا کی خدائی کو نمرود کی خدائی کے مترادف قرار دے رہا ہے جیسے ڈاکٹر اقبال نے کہا ہے ۔

مندر سے لے پیا سے کو شبنم

بخیلی ہے یہ رزائی نہیں ہے

لیکن جب شعر کے دوسرے ہنر اور زیادہ پر اثر معنی بلا تکلف نکل سکتے ہیں تو یہ معنی قبول کر لینا ہرگز مناسب نہیں ہے۔

نظم طباطبائی صاحب نے اس شعر کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ شاعر معشوق کے خرد و جس کے خلاف شکایت کر رہا ہے۔

اس شعر کے ایک معنی تو یہ ہو سکتے ہیں کہ شاعر خدا سے فریاد کرتا ہے

کہ فرد نے خدائی کا دعوے کیا تھا اور میں نے تیری بندگی کی تھی، لیکن
دونوں کا انجام ایک ہی رہا، یعنی نامرادی اور ناکامی۔ تیرا یہ کیا نقص
ہے کہ تو نے فرد کے خدائی کے دعوے جیسی دہرہ دست فاش خدائی
اور بنیاد کا اور میری بندگی کا ایک ہی سلسلہ دیا؟ تو نے اپنے تاثرات
اور فرمانبردار بندوں کو ایک ہی قسم کے سلوک مسخ کیوں سمجھا؟
وہ سب سے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ شاعر اپنی بندگی کا تجزیہ کر رہا ہے
وہ کہتا ہے کہ کہیں میری بندگی میں غلوں نیست کے بجائے چندار،
نخوت، خود پستی یا خود خدائی کے وہی عناصر تو نہیں پائے جاتے
تھے جو فرد کے جھوٹے دعوے خدائی کے محرک تھے؟ اور کہیں یہی
دہرہ تو نہیں ہے کہ مجھے اپنی اس قسم کی جھوٹی بندگی کا کوئی اجر نہیں ملا؟
ماصل یہ کہ جس طرح خدائی کا دعوے خدا کے قدر و منصب کا
سوجب بن سکتا ہے اسی طرح ریاکارانہ بندگی بھی اس کی تار فگی اور
چٹوٹی کا سبب ہو سکتی ہے۔ یہ اشارہ بھی مضمر ہو سکتا ہے کہ چندار و
نخوت وغیرہ کے مذہبات مغلی صرف جھوٹے دعوے خدائی میں نہیں
جھوٹے اٹھارہ بندگی میں بھی ردنا ہو سکتے ہیں۔ ایک دوسری جگہ
غالب ہی نے کہا ہے کہ

اتدہ مجزوبے سامانی سحر مون توام ہے
جسے تو بندگی کہتا ہے دعوئے ہے خدائی کا

سہ جے ہی سہی پسند ہیں۔ قرطبی

اس شعر کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ شاعر اپنے مسنون کو طعن
 لے کر کہتا ہے کہ کیا تیری مملکت جسٹس نرود کی ندائی کے مترادف تھی
 جہاں بندگی کا کوئی سلسلہ نہیں ملتا تھا۔ دیکھ میں نے تیری اتنی بندگی
 کی، لیکن ہمیشہ ناکام اور تائراؤ ہی رہا۔



گلہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا گھر میں محو ہو اضطراب دریا کا

بغاہر غالب کا یہ شعر کچھ ایسا مشکل نظر نہیں آتا، لیکن اس کے
معنی بیان کرنے میں شاعرین کے درمیان بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ میں
مختصر ان کے اقوال نقل کرتا ہوں۔

جناب نظم مباحثائی۔

”یعنی شوق دل میں سا کر تنگی جا کے سبب بے ہوش و خروش نہیں ہو سکتا
گویا دریا گھر میں سا گیا کہ اب تلاطم باقی نہیں رہا۔“
مولانا حسرت موہانی اور جناب شوکت میر تقی، تغیر اتفاق جناب
مباحثائی کی شرح سے اتفاق کرتے ہیں۔

حضرت تہا۔

”غالب شوق یا مشن کی وسعت قلبی بیان کرتا ہے کہ دل کی وسعت
اس وسیع جذبے کے لئے ناکافی ہے اور اس کی مثال میں دوسرا مصرعہ
پیش کرتا ہے یعنی جس طرح موتی میں بوجہ عدم وسعت اضطراب دریا کی
گنگنا لکڑ باقی نہیں رہتی اسی طرح میرے دل محدود میں ماحیات شوق
و عشق کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔“

حضرت داؤد وکنی۔

”شاعر نے اس شعر میں شوق کو دریا سے اور دل کو گھر سے تشبیہ

دی ہے، اور کہتا ہے کہ دریا یعنی شون، گوہر عینی دل میں محو ہو گیا۔
 باوجود اس کے شون تنگی جا کا گلہ مند ہے مالا لکھ دل کی وسعت معلوم
 ہے..... اس شون کو تمام زمین و آسمان کی گنجائش کافی اور یکتا نہ ہوگی
 قائل کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا شون بے مدد ہے حساب ہے۔ اس شعر میں
 اپنے شون کی وسعت و فراخی بیان کرتا ہے، مگر مرزا کا یہ طرز بیان
 اہل فصاحت کے پسند نہیں ہو سکتا۔

حضرت تاج محمد دہلوی —————

ترزا قہر کے لمحے میں فرماتے ہیں کہ شون کو تنگی جا کا گلہ دل میں بھی
 ہے۔ یہ ”بھی“ کا لفظ بتا رہا ہے کہ دل ایسی وسیع چیز ہے کہ دونوں عالم
 اس میں سما جاتے ہیں اور پھر خالی رہتا ہے۔ باوجود اس وسعت کے
 شون کو جگہ کی تنگی کا گلہ ہے، معلوم ہوتا ہے کہ شون کی وسعت بھی
 دل کی وسعت سے کسی طرح کم نہیں۔ اب تنگی جا کا ثبوت ملاحظہ ہو۔
 فرماتے ہیں گٹر میں دریا کی روانی محو ہو گئی یعنی کورہ میں دریا سا گیا مگر
 پہنچ جانے کے سبب موجوں کی حرکت بند ہو گئی۔ دل کو گوہر اور شون
 کو دریا سے تشبیہ دی ہے جو بالکل نئی تشبیہ ہے، کچھ ہے اس مطلع میں
 دریا کو کورہ میں بند کر دیا ہے اور مطلع یہ کہ چستی بندش، تناسب
 الفاظ، طریق بیان میں فرق نہیں۔ دونوں مصرعے ایک ہی سانچے
 میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔“

حضرت نظامی بدایونی —————

”گھر میں محو ہوا اضطراب دریا کا۔ دریا گھر میں سا گیا۔ گھر کو دل سے اور شوق کو اضطراب دریا سے مشابہت دلی ہے۔“
 حضرت آخر لکھنوی،

..... شعر کا حاصل یہ ہوا کہ مہذبہ شوق نے اپنی وسعت اور چٹائی کا اندازہ لگانا چاہا، پورے دل پر محیط ہو گیا، پھر بھی تسلی نہ ہوئی دل دریا ہے شوق اس دریا کا موتی ہے جس میں پورے دریا کا اضطراب بشکل موج گوہر مہذبہ شوق پورے دریا پر محیط ہے۔ دریا کے تونکا و طوفان (اضطراب) کو سیٹھے ہوئے ہے تاہم تنگی مابا کا شاکھی ہے۔ گویا وسعت مکان و لامکان پر چھاما نا چاہتا ہے، بظاہر سعی طلب کی تمام منازل طے کر چکا ہے، تاہم قانع نہیں بلکہ اور ترقی کرنا اور آگے بڑھنا چاہتا ہے جو انسان کی فطرت کا لیند تھا تھا ہے، کبھی قانع نہ ہوتا کسی منزل پر دم نہ لینا۔“

حضرت نیاز فتحپوری،

”مفہوم یہ ہے کہ میرے شوق محبت کی شدت و وسعت کا یہ عالم ہے کہ دل ایسی چیز میں بھی (جو وسعت و جہاں اپنے اندر رکھتا ہے) نہیں سما سکتا تھا لیکن مجبوراً اُسے دل کے اندر ہی سمانا پڑا۔ گویا یوں سمجھئے کہ ایک اضطراب تھا دریا کا جو گھر کے اندر بند ہو گیا۔“

جناب تجرود موہانی،

”مرزا کہتے ہیں کہ اضطراب دریا کو اضطراب شوق سے کیا نسبت؟

اضطرابِ دریا کی بساطِ صفت اتنی ہے کہ اودھ رو یا رپانی، نے موتی کی صورت
اختیار کی اور اس کا اضطراب کا فور ہو گیا۔ اگرچہ موتی میں گتھا لیشس ہی
رہتی ہے۔ اس کے مقابلے میں اضطرابِ شوق کی وسعت دیکھئے کہ دل ایسے
مقام میں بھی تنگی جا کا شاکی ہے، جس کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ اس میں ستر
کونین ہی نہیں بلکہ ہمارے ربانی بھی سما سکتے ہیں ۛ

میں خود جنابِ تجو دوہانی کی شرح سے متفق ہوں۔ بیشتر دیگر خادمین
کے مطالب جو بختِ طوالت پیش نہیں کئے گئے ہیں۔ جنابِ نظمِ طباطبائی اور
حضرت فیاضِ فقہوری کے مطالب کے ہم آہنگ ہیں۔ البتہ تسلیمِ پیشی صاحبِ کتب
جنابِ تجو دوہانی کی تائید کی ہے۔

میرا خیال ہے کہ شوق اور دل کے ساتھ دریا اور گوہر کے مماثل الفاظ
شعر میں آہانے سے بیشتر شاعرین کا ذہن اس طرت رجوع ہو گیا کہ شاعر
نے ان کے تشبیہ کا کام لیا ہے۔ حالانکہ یہ ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا، کیونکہ پہلے
مصرعے میں وہ شوق کا لہرِ دل میں تنگی جا، کا بیان کرتا ہے، اور
دوسرے میں دریا کا اضطراب گہر میں ہونا، ظاہر کرتا ہے۔ ایک کے اطمینانی
اور دوسری اطمینان کی صورتیں۔ ان متضاد کیفیتوں کے باعث تشبیہ
کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا۔

شاعر شوق اور دل کے مقابلے میں دریا اور گوہر کو صرف مثال کے
طور پر پیش کرتا ہے اور چمکے یہ مشابہات بھی ہیں لہذا لطفِ بیان میں
امناز ہو گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ انسان کی قنائیں اُس کے دل میں

کبھی پختی نہیں بھیتیں اور ہمیشہ دل کی وسعت کو بقدر حوصلہ نہ پا کر پراگندہ اور پریشان رہتی ہیں۔ لیکن بر خلاف اس کے دریا (پانی) جس میں ہر وقت موج اور اضطراب کی سی کیفیت رہتی ہے کبھی موتی بن کر بالکل ساکت اور ساکن بھی ہو جاتا ہے۔ بنیادی خیال یہ ہے کہ دریا ایسی ہر دم رواں اور دواں چیز کو تو قرار ممکن ہے لیکن انسان کے خون کو ہمیں۔ دل کے ساتھ "بھی" کا لفظ یہ اشارہ کر رہا ہے کہ دل کی وسعت کچھ ایسی حقیر نہیں ہے۔ اور کم سے کم وہ گہرے تو زیادہ بجا ہے۔ انسان کے خون کی فراوانی دریا کی مسلسل روانی سے بھی زیادہ ہے۔

(ماضیہ) "اس شعر کے ساتھ اگر یہ شعر چڑھا جائے تو مطلب پر مزید روشنی پڑے گی۔"

سیری ضمت میں خم گزرتا تھا دل بھی پار بکئی دیے ہوتے "

ترجی

ہنوز محرمی حسن کو ترستا ہوں کرے ہے ہر بے مو کا م چشم بنیا کا

شعر کے معنی صاف ہیں معنی میں ابھی تک حسن کا راز دواں یا حقیقت آشنا نہیں بن سکا ہوں، اگرچہ میرے ہر بال کی جڑ ایک چشم بنیا ہو مگر اس کا نظارہ کر رہی ہے۔ مطلب یہ کہ میں بے شمار آنکھوں سے باسرتا پا نگاہ ہو کر اُس کے حسن کا تماشا کر رہا ہوں لیکن ابھی تک مجھے اس کی بارگاہ میں قربت کا درجہ حاصل نہیں ہو سکا ہے۔

آخر صاحب لکھنوی اس شعر کا نظیری کے اس شعر سے

بذر ہر بے مو چشم روشن سست مرا

برداشتائی ہر ذرہ روز نے سست مرا

(میرے ہر بال کی جڑ کے نیچے میرے لئے ایک چشم روشن ہے

اور تیرے دیدار کے لئے ہر ذرہ میرے لئے ایک کھڑکی ہے)

موازد کہتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کیا غالب کا مصرع 'کرے ہے ہر بے مو

کا م چشم بنیا کا۔ نظیری کے مصرع 'بذر ہر بے مو چشم روشن سست کا ناقص

ترجمہ نہیں ہے؟ ناقص اس لئے کہ غالب نے بے مو کو چشم بنیا کہہ دیا اور

نظیری نے بذر ہر بے مو کہہ کر چشم روشن کو لوک پلک سے بھی درست کر دیا۔

درحقیقت غالب کا مصرع نظیری کے مصرع کا ترجمہ بالکل نہیں ہے

اور غالب اسی وجہ سے ناقص ترجمہ فرما دیا گیا ہے جو متفقہ افسانہ

انصاف نہیں ہے۔ ایک عامۃ الورد مضمون کو دونوں ہی شعر نے بھرا دیا
 قافیوں کی پابندی کے ساتھ اپنے اپنے طرز سے ادا کیا ہے۔

غالب نے بچہ کو چشم بینا کہہ دیا تو نہیں معلوم کیا قیامت ہو گئی
 اور نظیری نے ذرے کو روزن کہہ دیا تو کوئی عیب نہیں سمجھا گیا۔ غالب
 کے مصرعہ ثانی کے یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں: میرا رویاں رویاں چشم بینا کا
 کام کر رہا ہے؟ غالب کی چشم بینا، کو نظیری کی 'چشم روشن' پر چرخییت
 حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ لیکن جس طرح غزل کی بھرا دوزن کی
 بنا پر غالب صرف بچہ کو کہنے پر مجبور تھے، اسی طرح نظیری کے لئے بھی قافیہ
 کے لحاظ سے چشم روشن کہنا ناگزیر تھا اور یہ کوئی عمل اعتراض نہیں ہو سکتا۔

آخر صاحب آگے فرماتے ہیں: غالب اور نظیری کے اشعار متحد المضمون
 ہیں۔ غالب نامحرمی صن کا اعتراض کر کے شعر مانتے ہیں لیکن نظیری خون
 نفاذ کے ساتھ کثرتِ جلوہ کا سامان مہیا کرتا ہے۔ روزن کسی مکان میں
 ہوتا ہے، اس حرمِ قدس کا کیا شکاں جس میں ہر روزہ ایک روزن کا کام
 لے۔ نیز اس خون کی کیا انتہا ہے کہ ہر بچہ کو چشم روشن بنا دے۔ چہ کہ
 ہر روزہ کو تابندہ کیا اور روزن کے استعارہ کیا، لہذا معلوم ہوا کہ نور
 ہنوز ہر ذرے کے روزن سے چھن چھن کے مشتاقوں کو دعوتِ نفاذ لے
 رہا ہے۔ یہ روزن بے شمار اور مشتاقانہ کہ بہت چشم موبن کر رہا ہوگا
 سے گل جبینی جمال کر رہا جو ناممکن ہے، لہذا خون بدستور نشہ دہتا ہے
 منہا یہ بات بھی نکل آئی کہ حسن کی مکمل معرفت محال ہے اسی گوشے کو

نظیری کے مصرعے سے مستعار لے کر غالب نے اپنے شعر کی کائنات بنایا، تاہم
نظیری کی منتقیت کی جاتی ہے اور غالب کو بڑھایا چڑھایا جاتا ہے۔ خدا
کی قدر تصحیح اور کیا کہا جائے؟

دونوں اشعار زیر بحث کو سن سنی سے دیکھا جائے تو وہ متحد المضموم ہرگز
نہیں ہیں۔ آخر صاحب کا غالب پر خاص اعتراض یہ ہے کہ وہ ناٹھری حسن
کا اعتراف کر کے ٹھہر جاتے ہیں، لیکن نظیری شوق نگارہ کے ساتھ کثرت
جلوہ کا سامان مہیا کرتا ہے۔ نظیری کا پہلا مصرع
بزمِ ہر بیک کو چشمِ روشنی مست مرا
صرف شوقِ نگارہ غاہر کرتا ہے۔ اور دوسرے مصرع
بردشالی ہر ذرہ روز نے مست مرا

میں بھی زیادہ زور شوقِ نگارہ ہی پر ہے۔ صرف ثانوی پہلو کثرتِ جلوہ
کا بھجنا ہے۔ خیر اس سلسلے میں آخر صاحب ہی کا قول تسلیم کر لیا جائے کہ
”اس حریمِ قدس کی وسعت کا کیا ٹھکانا ہے جس میں ہر ذرہ ایک روزن
کا کام ہے“ تو یہی اس سے یہ بات کیسے پیدا ہوئی کہ ”روزن بے شمار
اور عشق کا نظام کہ ہمہ تن چشمِ مژدہن کر ہر روزن سے گل پہنی جمال کر دو
ناممکن ہے، لہذا شوق بہ ستور شد زہتا ہے، منہا یہ بات بھی نکل آئی کہ
حس کی مکمل معرفت محال ہے“ یہ تو وہی بات ہوئی کہ

گلں کو باغ میں جانے نہ دینا
کہ تاجِ خون پر دانے کا ہو گا

نظیری کے شعر سے یہ مطلب ہرگز نہیں نکلتا کہ گل چینی جہاں ناممکن ہے
 شوق بدستور نشہ رہتا ہے اور حسن کی مکمل معرفت محال ہے بلکہ اس کے
 برعکس یہ مطلب بالکل سامنے کھڑے کہ نفاے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود
 ہے، مواقع کی بھی کمی نہیں کیونکہ بے شمار کھڑکیاں کھلی ہوئی ہیں۔ لہذا
 اس سے خفا اگر کوئی بات نکالی بھی جاسکتی ہے تو صرف یہ کہ خوب جی بھر کر
 گل چینی جہاں کر رہا ہوں۔ آخر صاحب کی رائے میں یہ صورت حال ناممکن
 بلکہ محال ہے لہذا اس کی مدثنیٰ میں نظیری کا شعر مطلق اور پیچیدہ ہو کر رہ جاتا ہے
 سمجھ میں نہیں آتا کہ غالب کے شعر میں کثرت جملہ، ان کی کیا کمی
 رہ جاتی ہے؟ اس حرم قدس کی وسعت کا کیا شکاں؟ جس کا نظارہ
 ہر لمحہ سو کر رہا ہے، لیکن 'ہنوز' 'میری حسن کو قفس رہا ہوں۔ خود
 غور فرمائیے جس کے تماشائی کا یہ حال ہو اس تماشے کا کیا کہنا۔ وہ لامحدود
 اور بے پناہ نہیں تو اور کیا ہے؟ وہ ذروں کے بھر دکوں سے محصور نہیں
 بلکہ ساری کائنات پر محیط ہے۔

نکاح تو یہ ہے کہ غالب نے نہ صرف وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو نظیری
 نے کہا تھا بلکہ اس میں قابل قدر اور بہت ضروری اضافہ کر کے اسے
 بہت دلآویز اور معنی خیز بنا دیا ہے۔ الفاظ کا انتخاب 'ہنوز' 'میری حسن'
 'ترستا ہوں' 'داد سے مستغنی ہے'۔ نظیری نے صرف تصویر کھینچی تھی۔
 غالب نے تصویر کو زبان بھی دے دی۔ نظیری کا شعر صرف درشاعرانہ
 تقل ہے۔ اور غالب کا شعر 'ترجمان حقیقت' اور پھر دونوں کے

مرداد میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔

(ماشیہ) آپ نے درست فرمایا کہ یہ دونوں شعر متحد المضمون نہیں ہیں ۔
 نظریہ اپنے آپ کو محرم صحت بناتا ہے ۔ اور غالب و نادر صحت ہے ۔

عرشی

میں اور بزم سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا

گنجینہ مستحقین میں حضرت تجوید موبانی نے اس شعر کی شرح کی ہے
اور واقعہ یہ ہے کہ حق شرح ادا کر دیا ہے۔ میں اُسے اختصار کے ساتھ یہاں
درج کرتا ہوں۔

”اس شعر میں کئی ٹکڑے معنی خیز ہیں۔۔۔۔۔

میں اور :۔ اس سے مجھ میں آتا ہے کہ یہ سیکش دھات کا پینے والا ہے۔
اس کے فضائل و نمانہ سے ساقی اور رندوں کا سارا گردہ خوب
واقعہ تھا..... جسے شراب نہ ملنے کی تکلیف کے ساتھ ساتھ
رندوں میں اپنی ہے آبرو دینی پر چٹکیں ہونے کی بھی اذیت ہے۔
بزم سے :۔ اس ٹکڑے نے بھی معنی شعر میں زور پیدا کر دیا ہے۔
اگر تنہائی میں ساقی نے بھی برتاؤ کیا ہوتا تو ناگوار ضرور ہوتا،
مگر نہ اتنا۔

یوں :۔ اس سے سننے والے کی نظر میں ایسے رند ناکام کی تصویر بھر جاتی
ہے جسے اپنی ناکامی پر انتہا کا ملال، حد کا غصہ ہو، اور تکلیف
خارج جس کی جان لئے لیجی ہو۔

تشنہ کام :۔ اس سے ملن و زبان کے کانٹوں کا تصور ہونے لگتا ہے
جو شدت تشنگی کا ترجمان ہے۔

آؤں۔ اس زہم شراب میں نشہ کام گردل میں اُمید لئے ہوئے جانے اور
 یہ نشہ اور دل مایوس لئے ہوئے پٹنے کی حالت آئینہ ہو جاتی ہے۔
 دوسرے مصرع میں کہتا ہے کہ میں نے تو شراب اس لئے نہ مانگی کہ توبہ
 کر چکا تھا، آخر ساقی نے منکافت کیوں نہ کی، یعنی اس عالم کی بھم میں
 کیوں نہ آیا کہ رندوں کی توبہ ہی کیا۔ اور اگر اُسے پینا نہ ہوتا تو رندوں
 کے چمکے میں آکا ہی کیوں۔ ہمارا مقصد یہی تھا کہ توبہ کی لاج رہے اور
 رند چل دیں، یہاں رندوں کا ذکر کیا، ساقی کہ بخت نے بھی جھوٹوں نہ
 پچھا اور عالم کی زبان سے اتنا بھی نہ بھلا کہ اچھا پیتے بھی جاؤ۔
 ساقی کو کیا ہوا تھا؟ اس کے بہت سے مفہوم ہو سکتے ہیں، مستند
 لہجے میں تغیر پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

کیا اس نے بھی توبہ کی تھی؟

حیرت ہے کوئی دہ بھم میں نہیں آتی!

اس پر سیرا احترام واجب تھا!

انشہ ری ہے دروی، انشہ ری سنگ ولی!

رندوں کی حالت کا صحیح اندازہ رکھتے ہوئے ایسی غلطی!

کیا مجھے دیکھا نہیں؟

کیا میرے توبہ کرنے پر خفا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

مجھے اس شعر کے متعلق سرت ایک بات عرض کرنا ہے۔ دوسرے

مصرع کے اس بکڑے میں، گریں نے کی تھی توبہ!۔ لفظ ”گر“ بڑا مسمیٰ خیز

اور لطف ہے۔ اس سے شاعر کا توہ کرنا یقینی نہیں بلکہ مشتبہ ہو جاتا ہے اور شعر کے مضموم میں ایک اور ندرت پیدا ہو جاتی ہے۔

شاعر بڑے تک بڑی آس لگا کر پہنچتا ہے لیکن دہاں کوئی پوچھتا بھی نہیں اور وہ بڑی نا پوسی سے لشکر کام واپس آتا ہے۔ اب وہ سوچتا ہے کہ ممکن ہے کہ کسی نے ساقی کے یہ کان بھونک دیے ہوں کہ میں شراب پینے سے تو بہ کر چکا ہوں لیکن یہ وجہ بھی معقول نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ میں تو بہ کر چکا تھا تب بھی ساقی کا فرض تو یہی تھا کہ وہ مجھے شکست تو بہ کی دعوت دیتا۔ آخر اس نے ایسا کیوں نہیں کیا۔ یہاں مگر یہ کہ کسی مضموم ہو سکتے ہیں۔

اگر اچھا، یہ مان بھی لیا جائے کہ، ہنرمیں محال، ساقی کو بھی اطلاع ملی تھی کہ، دغیرہ دغیرہ۔

شاعر ساقی کی شکایت کرنے سے پہلے اس ممکن صفائی کو رد کر دیتا ہے جو ساقی کی طرف سے پیش کی جا سکتی ہے۔ اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ شاعر نے واقعی تو بہ کر لی تھی بلکہ صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ اگر ساقی کو اس قسم کی بھی اطلاع ملی ہوتی تب بھی اسے میرے ساتھ اس قسم کا برتاؤ نہ کرنا چاہئے تھا۔

یہ شعر قادر الکلامی اور حسن بیان کا ایک نادر نمونہ ہے۔ کم سے کم اعجاز میں زیادہ سے زیادہ مضمون ادا کیا گیا اور کوئی بات بھی بہم نہیں ساتھ ہی ساتھ نہ صرف کوئی لفظ بھی بھرتی کا نہیں ہے بلکہ ہر لفظ اور

مکڑے سے دوسرے کو زور پہونچا رہا ہے۔
 بعض حضرات نے غالب کے اس شعر کو بگلی دختر امیر علی بلبل کے
 اس شعر کا جہہ بتایا ہے۔

من اگر توبہ زے کردہ ام، اسے سر دہی
 تو خود ایں توبہ نہ کردی کہ مرا سے نہ دہی

دونوں اشعار ایک عامۃ الورد و مضمون کو بیان کرتے ہیں لہذا اس کے
 لئے عکاسی، خوشہ چینی یا توارد کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ایسے
 چلنے پھرنے اور بالکل سلسلے رکھے ہوئے معنایں کے سلسلے میں دیکھنا
 یہ نہیں ہوتا ہے کہ مرکزی خیال کیا ہے، بلکہ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کس طرح کہا
 ہے اور مرکزی خیال میں کون سے نئے پہلو نکالے ہیں۔

بگلی کا انداز بیان بالکل سیدھا سادہ ہے۔ اور پہلے مصرعہ میں سر دہی
 کے الفاظ بھرتی کے معلوم ہوتے ہیں۔ غالب اپنے شعر میں ایک ڈرامائی فضا
 پیدا کر دیتے ہیں اور ہر ہر لفظ اور مکڑے سے بنیادی خیال میں کئی لطف انگیز
 پہلوؤں کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ کہاں صرت ”تو خود ایں توبہ نہ کردی“ کی
 مفصل سی شکایت اور کہاں ”سانی کو کیا ہوا تھا“ جیسا پہلو دار مصرعہ!
 بگلی نے جو کچھ کہا ہے وہ غالب نے صرت اپنے مصرعہ ثانی میں اس سے کہیں
 بہتر انداز میں کہہ دیا ہے۔ مصرعہ اولیٰ میں جو کچھ کہا ہے اور بہت ہی خوب
 کہا ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔

ذره ذرہ ساغرِ مے خانہٴ نیرنگ ہے گردشِ مجنوں بچکھائے لیلِ آشنا

ساغر :- پیاز :- جس کی خاصیت گردش میں آنا ہو ۔
میں خانہٴ نیرنگ :- میخانہٴ طلسم ، مراد گردشِ ایلیم ، انقلابِ زمانہ ۔
چشک :- اشارہ ۔

حضرت آخر کھنوی نے اس شعر کی تشریح یوں کی ہے اور واقعی
بہت خوب کی ہے :-

” غالب کا یہ شعرا کے انفرادی رنگ اور تخیل کی نادر کاری کا
آئینہ دار ہے ۔ دنیا کو با اعتبار تغیرات و فنا آمدگی میخانہٴ نیرنگ اور
ذروں کو جو تغیر و فنا کی نشانیاں ہیں ساغرِ میخانہٴ نیرنگ کہتا ، پھر اس
طلسم آبادی و دیوانی کو گردشِ مجنوں سے تعبیر کرنا اور چشکھائے لیلیٰ
(اشارہٴ مشیت) کا راز داں کہہ کر جوشِ رقص و مستی و میخانہٴ آرائی دکھا
دینا اور لفظ چشک لاکر مال و سم پیدا کر دینا حسنِ تخیل و جہولانی فکر
کا حیرت انگیز کرشمہ ہے ۔ شعر میں حکمت و فلسفہ و تصوف کا وہ ہدیہ
استراحت ہے کہ شاید رہا بدیہ

صاف الفاظ میں شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اس کا رخاۂ عالم میں
ایک ایک ذرہ و انقلابِ آمادہ ہے لیکن یہ کوئی غزالی کیفیت نہیں ہے
بلکہ اس کے پس پردہ مشیت کی شہ کار فرما ہے ۔ بالکل اسی طرح جیسے

مجنوں کی گردش کے محرک پہلے کے اشارے ہوتے تھے۔

ذرتے کو ساغر سے حمید کی خاصیت گردش کرنا ہے تعبیر کیا ہے اور اور اسی کی رعایت سے کارخانہ عالم کو میخانہ کہا گیا ہے اور حسن ان دو الفاظ کے استعمال سے شعر میں کیفیت و سستی کا انداز پیدا ہو گیا ہے۔ جس طرح میخانے میں ساغر گردش میں رہتا ہے اسی طرح کارخانہ عالم کا ایک ایک ذرہ بڑے والہانہ انداز سے گردش میں رہتا ہے یعنی اس میں ہمہ وقت مسلسل آگے پیچھے ہوتی رہتی ہے۔ لیکن یہ کیفیت اختفاری یا زربا نہیں ہے بلکہ اس میں ایک منظم قانون قدرت چھپا ہوا ہے بالکل اُنکی طرح جیسے رقص مجنوں میں، جو بظاہر دیوانگی معلوم ہوتی، کچھ اور کچھ بھی اشارہ یعنی پہلے کی مشہور اور بہت انفرادی مروجہ تھی۔ گردش مجنوں اور چٹکھائے پہلے سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا کا ہر ذرہ نہ صرف تابع مشیت ہے بلکہ دل و جان سے اس کا شیدائی اور فدائی بھی ہے۔ نہ صرف خیال، حسن بیان اور انتخاب الفاظ داد سے مستفنی ہے۔ شاعر نے بڑی چابکدستی سے کئی حسین مرتعے کھینچ دیے ہیں، اے خانے میں ساغر کی گردش، پہلی کی چٹکھ پر مجنوں کا رقص، ذرتے ذرتے یعنی کارخانہ عالم کی ہر چیز میں تغیر و تبدل یا اس کا منقلب ہوتے رہنا لیکن قانون قدرت کے منبسط و نظم کے ساتھ، دیوانگی میں ہشیاری اور اس طرح ایک نازک خیال اور لطیف نکتے کو بڑی دلاویز تشبیہوں اور استعاروں کے گہشتے میں پیش کیا گیا ہے۔ معنی کی وسعت اور الفاظ کی

قلت شاعر کی قادم الکلامی کا تین ثبوت ہے ۔

۱۔ گردشِ مجنوں بچھلکھائے لیسے آشنا : خود کتنا اچھا خیال
اور اندازِ بیان ہے اور پھر جب اس سے کارخانہء عالم کے انقلابات
میں قانونِ قدرت کی کار فرمائی مراد لی جائے اور جس کے لئے ذرے
ذرے کو ساغرِ میخانہٗ انیزنگ کہا جائے تو یہ صرف شاعری نہیں سحر
طرازی اور معجز بیانی ہو جاتی ہے ۔

انقلابِ روزگار پر غالب کے غیر متبادل کلام میں ایک شعر ہے :
خوشی، خوشی کو نہ کہہ، غم کو غم نہ جان اسد
قرارِ داخلِ احسب زائے کائنات نہیں



کوئی دیرانی سی دیرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھریا دایا

مولانا مآنی نے اس شعر کے دو مطالب بیان فرمائے ہیں۔
(۱) جس دشت میں ہم ہیں اس قدر دیران ہے کہ اس کو دیکھ کر
گھریا داتا ہے۔ یعنی خوف معلوم ہوتا ہے۔

(۲) ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی دیرانی کہیں نہ ہوگی
مگر دشت بھی اس قدر دیران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر کی دیرانی یاد
آتی ہے۔

آخر کھنوی نے اس شعر کی تشریح یوں کی ہے۔

”مجھے دشت میں ایسے مقام کی تلاش ہوئی ہو گھر سے زیادہ
دیران ہو لہذا دشت کا رخ کیا دہاں پہونچ کر یہ اندازہ ہوا کہ یہ
دیرانی تو کچھ بھی نہیں اس سے زیادہ تو میرا گھر دیران تھا۔“
آخر کھنوی نے واقعی ایک بالکل نئی بات نکالی ہے۔

”اگر شعر میں ’دیرانی سی دیرانی ہے‘ کے پیشتر لفظ ’کوئی‘ نہ ہوتا
تو بے شک شدت کی دیرانی کا مفہوم بھٹکتا مگر لفظ ’کوئی‘ نے شدت
دیرانی دشت کی تنکیر و تنقیص کر دی۔“

اس شعر میں شاعر کا بنیادی مقصد اپنے گھر کی بے پناہ دیرانی ظاہر
کرنا ہے، وہ کہتا ہے کہ میرا گھر اس قدر دیران ہے کہ اس کے مقابلے

میں دشت کی ضرب اشل ویرانی بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اثر صاحب کے بیان کردہ معنی کے پیش نظر اس شعر کو ذہنی قرار دینا صحیح نہیں ہے کسی شعر کے ایک کے زائد مطالب اسی وقت قابل قبول ہو سکتے ہیں جب کہ دونوں قریب قریب ہم پلہ ہوں ورنہ اگر ایک مطلب دوسرے سے ہر حیثیت سے فوقیت رکھتا ہو تو صرف اسی کو قبول کرنا چاہئے اور اگر یہ معیار پیش نظر نہ رکھا جائے تو پھر کچھ تان کر ہر بات کے ایک سے زائد مطالب نکالے جاسکتے ہیں۔

نیا زنجیری صاحب نے اپنی کتاب مشکلات غالب میں ارشاد کیا ہے کہ اگر پہلے مصرعہ سے یہ مفہوم پیدا ہو سکتا ہے کہ ”دشت کی ویرانی بھی کوئی ویرانی ہے“ تو بے شک گھر کی ویرانی دشت سے بڑھ جاتی ہے لیکن لفظ ”سی“ نے یہ مفہوم پیدا نہ ہونے دیا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ لفظ ”کوئی“ کی موجودگی میں صرف لفظ ”سی“ اس مفہوم کے پیدا کرنے میں کیوں مانع ہے؟ غالباً نیا ز صاحب کے خیال میں اس مفہوم کے لئے مصرعہ اولیٰ یوں ہونا چاہئے تھا ”کوئی ویرانی نما ویرانی ہے“

اس شعر کا مطلب بیان کرنے میں اثر صاحب نے لفظ ”کوئی“ پر زور دیا ہے، اور نیا ز صاحب نے لفظ ”سی“ پر اور اس وجہ سے دونوں نے ایک دوسرے متضاد نتیجہ نکالا ہے۔

دشت کی ویرانی کی ہیبت میں گھر کا یاد آنا عاشق کی کمزوری ظاہر

کرتا ہے۔ برخلاف اس کے یہ بات کہ عاشق نے اپنے ہاتھوں اپنے گھر کو
ایسا دیران کر رکھا ہے کہ اب اس کے مقابلے میں اُسے دشت کی دیرانی
بھی کچھ نظر آتی ہے اُس کے جنون کی شدت واضح کرتی ہے لہذا اغلب
یہاں ہے کہ شاعر صرف یہی کہنا چاہتا تھا۔

اسی موضوع پر تو سن کا شعر ہے

بائیں دشت میں سوئے صحرائیوں
کم نہیں اپنے گھر کی دیرانی

————— ❦ —————

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے کوئی بستلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

یہ بظاہر آسان اور نہایت سادہ شعر مزا اور اشاریت کی ایک بہترین مثال ہے۔ بہت کم اشعار کو وہ قبولیت عام حاصل ہوئی جو اس کو ہے۔ زبان زد عام ہو کر یہ اب ضرب المثل کے مرتبے پر فائز ہے۔ اس کے کئی مضموم ہو سکتے ہیں بخوت طوالت صرف اشاروں پر اکتفا کیا گیا ہے۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟

وہ تجھ سے پوچھتے ہیں یا اس طرح پوچھ کر وہ مجھے چھیڑتے ہیں۔
دوسروں سے پوچھتے ہیں یا پوچھتے رہتے ہیں یا بھری محفل میں ایسا
ناموزوں سوال کر بیٹھتے ہیں۔

بالآخر میرے جذب عشق نے اپنا اثر دکھایا اور وہ بھی پوچھنے پر
مجبور ہوئے۔

دوسروں کے منہ سے میرا تذکرہ سُن سُن کر انہیں بھی یہ معلوم کرنے
کا اشتیاق پیدا ہوا۔

تیم ان پر اپنا سب کچھ نکال چکے اور انہیں ابھی تک یہ بھی نہیں معلوم۔
آج کی بدولت میری صورت اور حالت میں وہ تبدیلی پیدا ہو چکی
ہے کہ اب وہ خود پہچان نہیں پاتے۔

اشراری ہے امتحانی کر انہیں یہ بھی نہیں معلوم۔
کوئی اور نہ جانتا تو بات بھی تھی لیکن وہ نہیں جانتے ! (اگر لفظ وہ
پر زور دیا جائے)

اثنائے تنگ و کام ہوں کہ وہ مجھے جانتے بھی نہیں۔
نفرت یا غصے سے بچ رہے ہیں۔
حسنِ توافل تو دیکھو۔

بسکے سامنے کیا شرمندہ کر رہے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

ایسے سوال کا جواب ہی کیا ہو سکتا ہے؟

جب جان بوجھ کر نادان بنا رہے ہیں تو ہم ان کے سوال کا جواب
کیا دیں۔

کوئی ایسا جواب بتاؤ جس سے وہ خوش ہو جائیں یا جو ان کی ناراضگی
کا باعث نہ ہو۔

ہم نامے شرم کے یا حسیٹ زدہ ہو کر جواب دینے سے قاصر ہیں۔

ان کی معصومیت یا سنگینی یا ستم غرضی تو دیکھو کہ خود بھی سے مجھ کو بچ
رہے ہیں۔ کوئی بتاؤ کہ ان کے ایسے عجوبہ سوال کا جواب کیا ہو سکتا ہے؟

اب ہمیں انہیں کیا بتائیں کہ ہم کون ہیں؟

ہماری کم ظرفی ہوگی اگر ہم بتا دیں کہ ہم ان کے لئے کیا کیا پاؤں ہیں
بچے ہیں۔

اس شعر کو پڑھنے میں صرف لہجے کے تغیر سے معنی کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس شعر کے مقابل میں غمت خان عاتقی کا یہ شعر پیش کیا جاتا ہے۔
 زمر دم یاری پڑ سدا کہ "عاتقی کیست؟" طالع ہیں

کہ عمر در محبت رفت دکا را آخر رسید اینجا

غالب کے شعر کے پہلے مصرعہ کے جو کئی مطلب بیان کئے گئے ان میں سے صرف ایک اس شعر کا بھی مفہوم ادا کرتا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں جو کچھ ہے وہ قطعاً اس کے علاوہ ہے۔ عاتقی کا شعر بہت اچھا ہے لیکن غالب کے شعر سے اس کا کوئی مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ایک چیز ہی دوسری ہے۔
 "کوئی جلاؤ کو ہم جلاؤں کیا؟" کا ٹکڑا لاجوا ہے۔ اس میں ایسی، مزاح، تعجب، حسرت، محبت سبھی کچھ تو نظر آتا ہے۔ عاتقی سمجھا سمجھا کر جو مطلب دوسروں میں بکالا ہے اُسے بلکہ اس سے بہتر کو غالب نے بڑی چابکدستی سے صرف ایک مصرعہ میں ادا کر دیا ہے۔ غالب کا یہ شعر قلیل الالفاظ اور کثیر المعنی کی ایک نادر مثال ہے۔

(حاشیہ) "غالب کے پہلے مصرعہ میں لفظ غالب کو مخلص ذکر کر دیا جائے، تو ایک مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ بناؤ ہم تم میں کون غالب ہے، دوسرے پر ایمان عیش و حسن میں کس کو غلبہ حاصل ہے، اب اگر جواب میں کہا جائے کہ میں غالب ہوں، تو یہ بات مناسب نہیں، اور دوسری شق فاقہ کے خلاف ہے۔

(ترشی)

ہے کہاں تینا کا دوسرا قدم یا رب ؟ ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پایا !

خاطرِ خدا سے فریاد کرتا ہے کہ یا رب تینا کا دوسرا قدم کہاں ہے جب کہ سارا دشتِ امکاں محض اس کے ایک نقشِ پا کی حیثیت رکھتا ہے۔ ماحولِ شرعیہ ہے کہ انسان کی تینا کے مقابلے میں امکانات کا میدان بہت تنگ ہے اور وہ ہمیشہ اسے پیچھے چھوڑتی رہتی ہے۔

انسان اپنے نظری تجسس کی بنا پر ہمیشہ اُن باتوں کی تینا کرتا رہتا ہے جو بظاہر دائرۂ امکاں سے باہر معلوم ہوتی ہیں۔ تینا کے محرک امکانات نہیں ہوتے کیونکہ ان کا حصول دشوار پھلے ہی ہو، ناممکن ہرگز نہیں ہوتا، اور انسان کی جدت پسند اور انقلاب انگیز ذات و مزاج ہمیشہ ناممکن کو ممکن بنادینے پر تکی رہتی ہے اور پھر جب وہ ایک ناممکن چیز کو ممکن بنا چکتا ہے تو وہ دوسری ناممکن چیز کو ممکن بنانے میں لگ جاتا ہے۔ اس کے اس راستے میں اس کی کوئی منزل نہیں ہے اور وہ اپنی فترت کا ککبلو میں آگے ہی بڑھتا چلا جاتا ہے۔

کل تک جو باتیں دائرۂ امکاں سے باہر سمجھی جاتیں انسان نے اپنی کوششوں سے آج انہیں ممکنات بنا دیا ہے لیکن اس پر بھی انسان کو قرار نہیں، دائرۂ امکاں میں وسعت ہو رہی ہے تو اسی مناسبت سے انسان کے حوصلوں میں بھی ترقی ہو رہی ہے اور اُن کا افق دُور سے

دور تر ہوتا جا رہا ہے۔ انسان کی خواہشیں ہمیشہ دائرۃ امکان سے آگے ہی رہتی ہیں۔ شاعر انسان کے اس بے پناہ جہد مسلسل کو دیکھ کر تعجب میں خدا سے پوچھتا ہے کہ انسان کی ہر دم رداں دواں فطرت کا مہلتا ہے مقصد کیا ہے؟ وہ آخر چاہتا کیا ہے؟ سارا دائرۃ امکان تو اس کی تنہا کے صرت ایک نقش پا کی حیثیت رکھتا ہے پھر اس لامحدود تنہا کا دوسرا قدم کہاں ہے؟ بڑا بلیغ اور ٹکرا انگیز شعر کہا ہے۔ اس مضمون کو اس طرح کہنا صرت غالب ہی کا حصہ ہو سکتا ہے۔

دائرۃ امکان کو مسخر کر کے انسان اور آگے بڑھنے کی تنہا کس طرح کرنا ہے اس کے لئے صرت ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔ ایک صدی قبل انسان کا ہوا میں اڑنا دائرۃ امکان سے باہر سمجھا جاتا تھا۔ تب انسان ہوا میں اڑنے کی تنہا کیا کرتا۔ وہ ہوا میں اڑنے لگا اور یہ بات دائرۃ امکان میں آگئی تو وہ چاند اور مریخ تک پہنچنے کی تنہا کرنے لگا ہے، اور جب یہ باع بھی دائرۃ امکان میں آجائے گی تو وہ دوسرے ستاروں تک پہنچنے اور ان پر نوآبادیات قائم کرنے کے منصوبے بنانے لگے گا، اور اسی طرح اس کی خواہشیں ہمیشہ دائرۃ امکان کو پیچھے ہی چھوڑتی رہیں گی۔

غالب نے 'دشت امکان' کو 'تنہا کا نقش پا' بہت خوب کہا ہے۔
 تنہا میں ہمیشہ امکانات کو روند کر ممکن سے ناممکن کی جانب بڑھتی رہتی ہیں، انسان کبھی چین سے نہ بیٹھنے والی فطرت اور اس کی کاوش لا تنہا ہی کا اعتراف بڑے ذہن نشین انداز سے کیا گیا ہے۔ یہ شعر غالب کے غیر متداول کلام میں ہے۔

طاؤس در رکابے، ہر ذرہ آہ کا یارب، نفس غبار ہے کس جلوہ گاہ کا

یہ شعر غالب کے غیر متداول کلام کا ہے۔ شعر اپنی معنویت کے علاوہ اپنے الفاظ کے حسن کے باعث بڑا لطیف اور جمیل ہے۔ آہ کا ذرہ، طاؤس در رکاب، اور نفس کو غبار کہنا غالب ہی کا حصہ ہے۔ قدرت تخیل اور قدرت بیان کا ایسا حسین امتزاج مشکل سے دیکھنے میں آتا ہے۔ غالب نہ صرف ایک بلند پرواز فلسفی بلکہ ایک عظیم المرتبت حسن کار بھی تھے۔ شاعر کہتا ہے کہ میری آہ کا ہر ذرہ اپنے ساتھ طاؤس لئے ہوئے ہے طاؤس اپنے پروں کی رنگینی اور دیدہ زیبی کے لئے ضرب المثل ہے۔ مراد یہ ہے کہ میری آہ میں تمام تر رنگینیاں بھری ہوئی ہیں۔ یارب! میرا نفس کیسی جلیل القدر بارگاہ حسن کا غبار ہے کہ جس کی بنا پر میری آہ میں بھی ایسی دلکش رنگ آمیزی ہو گئی ہے۔

شعر کا حاصل یہ ہے کہ اس بارگاہ حسن کی شان در بانی کا کیا بوجھنا کہ جس کی حسرت میں اگر میں آہ بھی بھرتا ہوں تو وہ بھی رنگین نظر آتی ہے نفس کو جلوہ گاہ کا غبار بہت خوب کہا ہے۔ جلوہ گاہ ایسی پاکیزہ ہے کہ وہاں اگر کسی چیز کو غبار کہا جاسکتا ہے تو دیکھنے والوں کے نفس (دماغ) کو وہاں کی پاک اور صاف فضا میں ہی ایک طوطا کرنے والی چیز ہو سکتی ہے۔

۱۴۰۔ بہر تاسانس لینے ہی کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ سانس میں ذرات بھی ہوتے ہیں اور خوردبین سے دیکھنے پر ان میں طرح طرح کے رنگ بھی پائے جاتے ہیں۔ ذرے کی رنگینی ظاہر کرنے کے لئے اُسے طافوس درو کاب کہنا حسین بیان کا ایک نادر کرشمہ ہے۔



ہے مگر موقوف بر وقتِ دگر کارِ اسد اے شبِ پروانہ دروزِ وصالِ عندلیب

یہ شعر غالب کے غیر متداول کلام میں ہے۔ شاعر نے ایک بڑی نازک بات بڑے سیکھے انداز میں کہی ہے۔ رشک، مایوسی اور اُمید کے جذبات کو سمو کر ایک ایسے انسان کی جو ناکامیوں اور نامرادیوں کی آذھیوں کے درمیان بھی اپنی اُمید کا چراغ جلائے بیٹھا ہو بڑی پُر درد تصویر کھینچ دی ہے۔

شاعر دیکھتا ہے کہ لات میں پھولنے کو شمع کا قصبہ مائل ہے اور دن میں جیل بھول سے ہلکا رہے۔ وہ ان عثمان کی مستقل سرشاریوں کا اپنی دائمی محرومیوں سے مقابلہ کرتا ہے تو اس کا دل گڑبھتا ہے اور وہ اپنی عاشقی کی ایک سبکی سی محسوس کرتا ہے مگر اپنی مایوسیوں کے اس خاکستر میں وہ ایک اُمید موبہوم کی چنگاری بھی دہلائے بیٹھا ہے۔ کہ شاید اس کا مشوق بھی اس پر تہربان ہو کر کہی اس کے پاس آجائے لہذا وہ 'شبِ پروانہ' اور 'روزِ عندلیب' کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ میری سرشاریوں کا زمانہ شاید کسی دوسرے وقت کے لئے ملوئی کر دیا گیا ہے لیکن خیر وہ کبھی نہ کبھی آئے گا ضرور!

بالکل وہی بات ہے جیسے کسی امیر باپ کے بچے کا نیا کھلونا دیکھ کر کوئی غریب باپ کا بچہ کہے۔ "جب ہائے آباؤ اُمیئیں گئے تو وہ بھی ایسا ہی

کھلونا ہمارے لئے لائیں گے یہ اس مصمصیت اور سادہ لوحی آپس کو پیار
اور نرمی نہ آجائے گا ؟

شاعر نے 'شبِ پردانہ' اور 'روزِ وصالِ حذلیب' کو صرف مخاطب
کر کے ایک طویل مضمون کو جو کسی دوسری صورت کا ایک شعر میں آجی نہیں
سکتا تھا ادا کر دیا ہے۔ محض اس اشارے نے یہ مضمون ادا کر دیا کہ مات
میں پردانہ شمع کے پاس اور دن میں بلبل پھول کے قریب موجود رہتا ہے
اور شاعر کو اپنے ہی جیسے عاشقوں کی یہ خوش ہنستی دیکھ کر رشک
ہو رہا ہے۔



ہوں داغ نیم رنگی شامِ وصالِ یار نورِ چراغِ بزم سے جوشِ سحر ہے آج

اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ غائب کو پیچیدہ نفسیاتی تجربات میں کتنی بڑی دسترس تھی۔ جس سلسلہ پر کوئی ماہرِ نفسیات چورا، ایک مضمون لکھتا اُس کو انھوں نے صرف ایک شعر میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ بحیثیت شاعر ان کے اظہارِ بیان کا یہی ایک ذریعہ ہو سکتا تھا۔

اس شعر میں شاعر ایک ایسے شخص کی نفسیات کی عکاسی کر رہا ہے جس کی ساری عمر ناکامیوں اور محرومیوں میں بسر ہوئی ہے۔ وہ اچانک اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی سے ہکنا رہ جاتا ہے۔ ایسے غیر متوقع موقع پر وہ بجائے اپنی خوشی سے لطف اندوز ہونے کے، اس اندیشے میں کہ اس کی یہ خوشی اس سے بہت جلد چھین جائے گی، پہلے سے یہی زیادہ غم زدہ ہو گیا ہے۔

گردِ شبنمِ رنگِ طسّر سے ڈر ہے

غنیمتِ محسوسِ محب و یہ نہیں

اپنی غم آشنا فطرت کے باعث وہ اپنی خوشی سے متعلق چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اس شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے کہ وہ اس کو غارت کر دینے پر تلی ہوئی ہے۔

وصالِ یار کی شام آئی تو عاشق کو مددِ جبرِ خوش ہونا چاہیے تھا لیکن

آج ہی اُسے چراغِ بزم کی روشنی سے صبح کی علامتیں جھلکتی دکھائی پڑ رہی ہیں صبح اور چراغ میں روشنی مشترک ہے لہذا عاشق اپنی شام وصال کو ”نیم رگلی“ سے تعبیر کرتا ہے یعنی پورے طور سے اُسے شام ہی نہیں مانتا اور جب شام ہی صبح آثارِ نمایاں جو جائیں تو ظاہر ہے کہ ایسی شام وصال سے کوئی کیا خطا اٹھا سکتا ہے۔ اور اس کی وجہ عاشق پہلے سے بھی زیادہ افسردہ ہو گیا ہے۔ خوشی میری ہوئی تو غم اس کا نفیب بن کر آیا۔ اس کا آغاز بھی نہ ہونے پایا تھا کہ انجام سامنے آگیا۔

ایک ناکام اور نامراد انسان بھی سوچتا ہے کہ ساری دنیا اُس کے خلاف سازش کئے ہوئے ہے جتنے کہ قانونِ قدرت بھی اُس کی خوشی کو غارت کرنے کے لئے بدل گیا ہے، شاعر نے ایک بڑی پیچیدہ اور نازک بات بڑے دل نشین انداز میں ادا کر دی ہے۔ یہ شعر غالب کے غیر متداول کلام کا ہے۔

ایک دوسرے شعر میں بھی نازکے شیع کو ”دلیلِ سحر“ کے طور پر پیش کیا ہے لیکن چونکہ اس میں شبِ سحر ان کی تصویر کشی نہیں لہذا وہ ”خوش ہے“ نہ
 قلمتِ کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
 اک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خوش ہے



اسدیہ عجز و بے سامانی فرعون توام ہے
جسے تو بندگی کہتا ہے دعویٰ ہے خدائی کا

توام ۱۔ مجڑواں بھائی ۔

یہ شعر غالب کے غیر متبادل کلام نسخہ احمدیہ میں پایا جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے ”عجز و بے سامانی اور فرعونیت میں چنداں فرق نہیں ہے“ بظاہر یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے بالکل متضاد نظر آتی ہیں لیکن گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ قول صداقت کا غالی نہیں۔

انتہائی عجز و بے سامانی میں انسان ہر قسم کی پابندی اور ذمہ داری سے آزاد ہو جاتا ہے اور اس کی ساری کائنات محض اُس کی ذات تک محدود ہو جاتی ہے۔ وہ دنیا اور دنیا والوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ یہاں بھٹتا ہے کہ صبح ہم سے خلافت ہو کے کرے گا زمانہ کیا؟

وہ زمانہ کی ہاں میں ہاں ملانے کے بجائے اس کو ٹھنڈ چڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اپنے آپ کو ہر قسم کی قید اور بندش سے بالاتر سمجھنے لگتا ہے۔ فرعونیت میں بھی یہی ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ دو متضاد کیفیتیں اپنے نتیجے میں ایک نظر آتی ہیں۔ شاعر نے غیر معمولی بصیرت کا کام لے کر ان دونوں کیفیتوں کو توام کہا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اسدیہ تیری عجز و بے سامانی فرعونیت کا کم نہیں ہے۔ جسے تو اپنی بندگی کہتا ہے وہ دراصل خدائی کا دعویٰ ہے۔ غالب نے ایک دیگر شعر میں اپنی بندگی کو سرود کی خدائی سے

تشبیہ دی ہے۔ سہ

کیا وہ نبرد کی خدائی تھی ہندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
شہر زیر بحث کا بنیادی خیال یہ ہے کہ خواہ اپنی فرعونیت کے
باعث خواہ اپنے مجزوبے سامانی کے باعث کوئی انسان جب عام
سامی اقدار کو پس پشت ڈال دیتا ہے تو وہ سماج کے لئے ایک خطرہ
بن جاتا ہے۔

(ماسٹیر) اس شہر باہمی طور غور فرمائیے :-

”یعنی مجزوبے سامانی اسد توام مجزوبے سامانی فرعون ہوا، اس لئے جس طرح مجز
فرعون نے اُسے دھولے خدائی سے نہ دکھا، اُنکی طرح مجز اسد نے اُسے بھی دھولے خدائی سے
باز نہ دکھا۔ فرعون کا دھولے خدائی تو ظاہر ہے کہ وہ بکار شائستہ اتار کیم لاطلی“ اسد کا دھولے
خدائی یہ ہے کہ وہ اپنے بندہ ہونے کا اقرار کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی موجود ہے،
بالفاظ دیگر جب کوئی شخص کسی کی ہندگی کا دھولے کرتا ہے، تو وہ معبود اور عابد
دونوں کا ہستیاں تسلیم کرتا ہے، اور وعدۃ الوجود کے ماننے والوں کے نزدیک معبود
کے علاوہ کسی ہستی کا تسلیم کرنا گویا اُسے خدا قرار دینا ہے، کیونکہ کثرت وجود سے
مستغنی صرف ذات باری ہے، دوسرے کو موجود قرار دینا اس کا شریک خدائی قرار
دینا ہے اور جب یہ شریک خود اُنھی کی ذات ہوا، تو اس کا مطلب ہوا دھولے
خدائی کرنا“

کون ہوتا ہے حریفِ مردانِ گلشنِ عشق؟
ہے مکر لبِ ساتی میں صلا میرے بعد

حریف :- مقابل۔

صلا :- آواز دینا۔ صدا لگانا۔

مے مردانِ گلشنِ عشق :- آدمی کو کھچاڑ دینے والی شرابِ عشق۔

مولانا مالتی نے اس شعر کے معنی یوں بیان کئے ہیں :-

”اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جبکہ میں مر گیا ہوں مے مردانِ گلشنِ عشق کا ساتی یعنی معشوق بار بار صلا دیتا ہے یعنی لوگوں کو شرابِ عشق کی طعنے بلاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے بعد شرابِ عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا اس لئے اُس کو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”مگر زیادہ غور کرنے کے بعد صیحا کہ مرزا غالب خود بیان کرتے

تھے اس میں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرعہ بھی ساتی کے صلا کے الفاظ ہیں اور اس مصرعہ کو وہ مکرر پڑھ رہا ہے۔ ایک دفعہ بجانے کے لمحے میں پڑھتا ہے ”کون ہوتا ہے حریفِ مے مردانِ گلشنِ عشق؟“ یعنی کوئی ہے جو مے مردانِ گلشنِ عشق کا حریف ہو۔ پھر جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا تو اس مصرعہ کو باپس کا کے لمحے میں مکرر پڑھتا ہے ”کون ہوتا ہے حریفِ مے مردانِ گلشنِ عشق؟“ یعنی کوئی نہیں ہوتا اس میں لمحے اور طرزِ آواز کو بہت دخل ہے۔ کسی کو بجانے کا لمحہ اور ہے

اور مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے۔ جب اس طرح مصرعہ مذکور کی تکرار کی جائے گی تو فوراً یہی معنی ذہن نشین ہو جائیں گے۔
 ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری نے غالب کے بعض ذومعنی اشعار کے متعلق لکھا ہے :-

”ایک خصوصیت ان کے کلام میں ایسی ہے جس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے کلام میں موجود نہیں ہے۔ جس طرح سفید رنگ میں تمام آفتابی الوان منظر ہیں، ان کے بعض اشعار کی سادگی میں عجیب و غریب لطیف معنی پنہاں ہیں۔“

یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ذومعنی اشعار کہنے کی خصوصیت صرف غالب کے لئے مخصوص ہے۔ ہر قابل ذکر شاعر کے کلام میں یہ خصوصیت کم و بیش پائی جاتی ہے البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اردو شعرائں غالب کے کلام میں مقابلہ ایسے اشعار نہ صرف تعداد میں بلکہ حسن بیان اور حسن معنی میں بھی بہت زیادہ ہیں۔

بعض نقادوں کا خیال ہے کہ اگر کسی شعر کے ایک سے زیادہ معنی نکلتے ہوں تو یہ شعر کی صفت نہیں بلکہ نقص ہے کیونکہ جہاں کسی شعر سے ایک سے زیادہ مطلب ادا کئے جانے کی کوشش کی جائے گی وہاں اپنی جگہ پر ہر مطلب سست اور مبہم ہو جائے گا۔ اس خیال کی بنیاد صرف ایک احتمال پر ہے لہذا اس سے کوئی مسئلہ نہیں قائم کیا جاسکتا۔ ایک ہی شعر سے ایک سے زیادہ ہم قہ مطالب ادا

ادا کر جانا یقیناً مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں۔ اور اگر کسی شاعر کی ہمت
دشوار پس درپنہ ہے یہ مشکل آسان کرے تو وہ یقیناً داد کا مستحق ہے۔

غائب کے شاعرین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ بعض اشعار کے
مطالب کے متعلق اپنے اپنے ذوق اور سخن فہمی کی بنا پر ان شاعرین
میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن اس اختلاف کے یہ معنی ہرگز نہ
لینا چاہئے کہ غائب کے اس قسم کے سب اشعار کے ایک سے زیادہ
مطالب ہیں۔ درحقیقت اپنی اپنی جگہ پر ان کا بنیادی مطلب ایک ہی
ہے جس کو مختلف شاعرین نے اپنے اپنے زاویہ نگاہ اور انداز بیان
کے سمجھا یا ہے۔

بعض اشعار کے صرف کچھ تان کر ایک کے زائد مطالب بیان کرنے کی
کوشش کی گئی ہے لیکن یہ کوشش اس وقت تک ناہی نہ پرائی نہیں جوتی
جب تک۔ یہ مطالب قریب قریب یکساں لطافت اور بلاغت کے حامل نہ ہوں۔
بہ غالب کے کچھ اشعار ضرور ایسے ہیں جن سے بلائکات ایک سے

زائد مطالب نکلتے ہیں اور ہر مطلب اپنی جگہ پر قریب قریب مساوی جثیف کے
مسکرم اور سخن نظر آتا ہے۔ ایسے فکر انگیز اور معنی خیز اشعار ان کی قادر ہکلامی
کا بہت ثبوت ہیں۔ مثلاً کہ بلا شاعر انھیں اشعار میں سے ایک اور بہت خوب ہے۔

فیضی نے کہا ہے کہ

گرد قفا سفند نہ حریفان ہنرم عشق
ہر خاک ریز جز عسکر مرد آزمانے را

مطلب یہ کہ ہر مشق کے مرد میدان خاک میں مل چکے لہذا اب مرد آ زما
(مردوں کو زیر کرنے والی) شراب کا کوئی پینے والا نہیں رہا، لہذا اسے
زمین پر لٹھھا ہے۔

غالب کا زیر بحث شعر فیضی کے شعر سے زیادہ پُر تاثیر ہے۔ ساقی کا
بار بار دعوت دینا اور کسی میں اس کے قبول کرنے کی ہمت کا نہ ہونا ایک
عجیب ڈرامائی اور دردناک منظر پیش کرتا ہے اور شاعر کے اس دعوے
کا کہ اس کے بھڑائے مرد افکنِ حش، کا کوئی حریف نہیں رہا مکمل ثبوت
بھی فراہم کر دیتا ہے۔ فیضی صرف ساقی سے فرمائش کرتا ہے کہ جو مرد
مرد آ زما، کو اب زمین پر لٹھھا دے کیونکہ اس کا کوئی پینے والا باقی نہیں رہا
فیضی کا شعر اپنی جگہ پر بہت خوب ہے اور تصور نہیں کیا جاسکتا کہ اب اس
موضوع پر اور کیا کہا جاسکتا ہے لیکن غالب کا شعر خوب تر ہے اور اُس نے
وہ سب کچھ کہنے کے بعد جو فیضی نے کہا ہے اُس میں ایک لا جواب نئے پہلو
کا اضافہ کر دیا ہے۔



چھوڑوں گا میں نہ اُس بتِ کافر کا پوچنا چھوڑے نہ خلقِ گو مجھے کافر کے بغیر

غالب کے چند اشعار کے متعلق فارسی کے بعض اساتذہ کا مرکزی خیال لینے یا اُن کی عکاسی کرنے کا جو الزام کچھ حضرات کی جانب سے کبھی علی الاعلان اور کبھی در پردہ لگایا جاتا ہے، اس کے سلسلے میں کچھ معدومات اس سے قبل پیش کئے جا چکے ہیں۔ جی تو یہی چاہتا کہ ایسے سب اشعار کے متعلق اس کتاب میں بحث کی جاتی لیکن چونکہ ان میں سے بیشتر پر حضرت بخاری مودانی ایسی سیر حاصل روشنی ڈال چکے ہیں کہ کم از کم میرے ایسے کم مواد کے لئے سوائے اس کے چارہ نہیں کہ اسی کتاب کے بہت سے مقامات نقل کر کے پیش کر دوں لہذا مجبوراً اس خواہش کی تکمیل سے گریز ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ارباب ذوق اُمم کتاب کا خود مطالعہ فرما سکتے ہیں۔ حضرت بخاری مودانی کے مضمون میں سب سے زیادہ اس حقیقت پر زور دیا گیا ہے کہ عام طور سے معترضین نے مقابل اشعار کا صحیح مفہوم اور مجموعی تاثر سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ اکثر عامۃ الورد مضامین کے متعلق بات ایک ہی ہوتی ہے لیکن کوئی شاعر اس کے کسی ایک پہلو پر اور کوئی شاعر کسی دوسرے پہلو پر زور دیتا ہے اور اس طرح اگر دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر ایک نیا خیال اور انداز بیان پیش کر دیتے ہیں تو اسے سہرتے یا توارد سے تعبیر کرنا بڑی نا انصافی ہے۔ البتہ یہ ایک

بالکل دوسری بحث ہوتی ہے کہ کس شاعر کے خیال اور انداز بیان کو
نویت حاصل ہے۔

میں نے اس کتاب میں صرف چند ایسے اشعار کو لینے پر اکتفا کی ہے
جن میں غالب اور اُن کے پیش رو شعرا کے خیالات میں بغاوت زیادہ سے
زیادہ نامتک پائی باقی ہے لیکن اس کے باوجود ان کے مجموعی تاثرات
میں بڑا نمایاں فرق موجود ہے۔

ذیب عنوان شعرا و خسرو کے اس شعر ہے
خلق می گوید کہ خسرو بُت پرستی می کند
آئے آئے می کنم با خُلق و عالم کار نیست

کے متعلق حضرت آگسٹس کا ارشاد ہے : ”خیال عام اور معمولی ہیں مگر اتنے
قریب ہیں کہ جذباتی مشکل ہے“۔ حضرت تجو دموبانی نے اس کا جواب
یوں دیا ہے : ”جب خیال عام ہیں اور معمولی تو پھر یہاں پیش کرنے کی
ضرورت ہی کیا تھی؟ چھوڑوں گا میں نہ! اور چھوٹے نہ خلقِ گور، ان
فکریوں سے غالب کے شعر کا حسن بڑھ گیا ہے“۔

میری ریلے میں ان دونوں اشعار میں ایک اور بھی ناوک سا فرق
ہے جو دونوں اشعار کے مطالب سامنے رکھنے سے خود بخود واضح
ہو جاتا ہے۔

حضرت خسرو کا ارشاد ہے کہ خلق کہتی ہے کہ خسرو بُت پرستی کرتا
ہے۔ ہاں ہاں میں کرتا ہوں مجھے خلق اور دنیا سے کوئی مطلب نہیں ہے

مفہوم یہ کہ دنیا والوں کو میرے اس کام پر اعتراض ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ معنی بھی نکل سکتے ہیں کہ خلق اور دنیا کو اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ مجھے ان کے اعتراض کی کیا پروا؟ حاصل شعر یہ ہے کہ عاشق کی نظر میں دنیا والوں کی رائے کی کوئی وقعت نہیں ہے اور وہ ان کا اپنے سے بچا ہوا ان سے کوئی خلق محسوس ہی نہیں کرتا۔

اس جگہ پر یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ شعر کے دوسرے مصرعے میں ”عالم“ کا لفظ محض ضرورت شعری کی بنا پر آیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کہا جائے کہ پہلے مصرعے میں صرف ”خلق“ کہا گیا تھا۔ لہذا دوسرے مصرعے میں ”خلق و عالم“ دونوں کہہ کر زور بیان میں اس طرح اضافہ کر دیا گیا ہے کہ دنیا والے کیا مجھے دنیا کی کسی چیز کی پروا نہیں ہے۔ لیکن ہر کیفیت ”عالم“ کا لفظ بیاں پر کھٹکتا ضرور ہے۔

غالب ایک بالکل دوسری بات کہتے ہیں۔ چھوڑے خلق گو مجھے کافر کہے مہربان کہہ کر وہ دنیا والوں کے اعتراض یا انگشت نمائی کی اہمیت انکار نہیں کرتے، خود ان کے اعتراض یا انگشت نمائی کرنے کے حق کو چیلنج کرتے ہیں بلکہ کہتے ہیں کہ میں جانتا ہوں کہ دنیا مجھ پر لعنت طاعت کرے گی اور درست کرے گی لیکن کروں کیا عیش نے بے بس کر رکھا ہے۔ میں اس بت کافر کی ہستش نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کے لئے میں دنیا کی ذلت اور حقیر کا ہفت جنتا ہوں تو بنا کروں۔ مجھے احساس ہے کہ میں کتنی بڑی قربانی کر رہا ہوں لیکن دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔

خستہ کو دنیا سے اپنی بیزاری میں یہ احساس ہی نہیں کہ وہ اپنے عیش کی کیا قیمت ادا کر رہا ہے۔ غالب کو اس کا اندازہ ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس کو خوشی سے ادا کر رہا ہے۔ ایک کی اضطراب کی کیفیت ہے اور دوسرے کی اختیاری صورت۔ خستہ دنیا والوں کے الزام کا صرف جواب دیتے ہیں، لیکن غالب آگے بڑھ کر اس کو دعوت دیتے ہیں۔

جیسا کہ حضرت تجوید موہانی نے اشارہ کیا ہے ”چھوڑوں گا میں نہ“ اور ”چھوڑے نہ ملن گو“ بڑے مناسب اور بر محل ٹکڑے ہیں۔ اسی طرح لفظ ”کافر“ ہر دمصرعوں میں بڑا پُر طعنت مفہوم پیدا کر رہا ہے۔ جسے شاعر پوچتا ہے وہ بھی کافر ہے اور اُسے پوچا کر خود بھی کافر بنا رہا ہے۔ شاعر قہجے سے بے خبر نہیں لیکن اس کے باوجود اپنی بات کا پورا اور دھن کا پکا ہے اور اُس نے جو نشان لیا ہے اُس کو پورا کر دکھانے میں اُس کے پائے استقلال میں کوئی جنبش نہیں ہے۔ انجام سے بے پردہ وہ اچھی بات پر اٹل ہے۔

خستہ کا شعر ایک شکستہ دل انسان کی پکار ہے اور غالب کا شعر ایک حوصلہ مند انسان کی لٹکار ہے۔ خستہ دونوں ہی اچھے اور بہت ہی اچھے ہیں، اب یہ انچا اپنا نظر ہے کہ کون کسے بہتر سمجھے۔

لرزتا ہے مراد دل زحمت مہر درخشاں پر
میں ہوں قطرہ شبنم کہ ہو خاریاں پر

بقول آغا محمد باقر صاحب عام طور سے شامین نے اس شعر کے معنی
یوں لکھے ہیں :-

شبنم کے چکنے کو لرزنے سے تعبیر کیا ہے۔ میں ایک ایسا قطرہ شبنم
ہوں جو خاریاں کی ٹوک پر آدیزاں ہے۔

آفتاب مجھے مذب کر لینے کے لئے کیسی کیسی سرگرمیاں دکھا رہا ہے۔
کہاں میں اور کہاں آفتاب؟ ٹوک خار پر ہونے کی وجہ سے میری فنا تو
دیے ہی بہت قریب ہے، اس لئے آفتاب کی تکلیف فرمائی پر میل دل لرزتا
ہے کہ اتنی سی بات کے لئے کس قدر کوشش کر رہا ہے۔

میں اس شعر کا مطلب یوں سمجھتا ہوں :-

میں ایک قطرہ شبنم ہوں ایسا حقیر اور بد نصیب کہ میں پھول پر بھی نہیں
بلکہ کانٹے کی ٹوک پر ہوں۔ چمن بھی میرا قدر نہیں ہے بلکہ بیابان میں ہوں
مہر درخشاں (چمکتے ہوئے آفتاب) کی ایک شعاع پڑتے ہی میں اس میں
مذب ہو کر فنا ہو جاؤں گا۔ لیکن میرا دل اس خیال سے کانپ رہا ہے کہ
میرے ایسے ناچیز اور تنہا مقدار قطرے کو مذب کرنے کے لئے مہر درخشاں کو مجھ کو
اپنی شعاع ڈالنے کی تکلیف گوارا کرنا پڑے گی! مطلب یہ کہ کاشش مجھے یہ
توفیق ہوئی کہ میں خود بخود آفتاب میں مذب ہو جاتا اور مجھے اپنے اس مقدور

تک پہنچنے کے لئے اس کی شاع کا احسان اٹھانا پڑتا۔

شعر کا بنیادی خیال یہ ہے کہ شاعر اپنی عالی ظرفی اس کیفیت کا
انتہائی حصر ہونے کے باوجود وہ کسی کا احسان نہیں لینا چاہتا، ظاہر کر رہا
ہے۔ خود تو کسی دوسرے کو اپنی جان تک جوئے کر دینے کے لئے تیار بیٹھا ہے
لیکن دوسرے کو اس سلسلے میں جو زحمت اٹھانا پڑے گی اس کو اپنے ادب
ایک احسان سمجھ کر اس سے فائدہ ہے۔ جان دینے میں کوئی بات نہیں لیکن
احسان اٹھانے کے خیال سے دل کانپ رہا ہے۔

شبنم اور آفتاب غالب کا مرغوب طبع مضمون ہے، کچھ اشعار
ملاحظہ ہوں :-

۴ تو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تسلیم
ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نذر ہونے تک
خور شبنم آستانہ ہوا ورنہ میں اسد
سرتابہ پاگزارشِ ذوقِ سجودِ وفا
میں چشمِ واکشادہ و گلشنِ نظرِ فریب
لیکن عبت کہ شبنم خورشیدِ دیدہ ہوں

یارب، وہ نہ سمجھے ہیں سمجھیں گے مری بات
مے اور دل اُن کو جو نہ مے مجھ کو زباں ور

شعر کیا ہے کڑی کمان کا تیر۔ سستے ہی دل میں اُڑ کر تیر کی مکیر بن جاتا
ہے۔ مطلب بالکل عام فہم ہے البتہ اس کے چند پہلو بڑے پُر لطفت
اور غور طلب ہیں۔

شاعر کہتا ہے کہ اگر مجھ کو دوسری زبان نہ مے تو اُن کا دل بدل کے
پہلی ترجیح اپنی زبان کے بدلے جانے کی ہے۔ یعنی میری زبان میں اسی تاثیر
مے مے کہ میں اپنے محبوب کے دل پر اپنا سکھ جاؤں۔ اس طرح انہی کو شورش
مے اس کو مسخر کر لینے کا لطف ہی دوسرا ہے۔ لیکن اگر یہ ممکن نہیں ہے تو
پھر اس کا دل بدل مے یعنی اس میں اسی اثر پذیر یا مادہ قبولیت پیدا
کر لے کہ وہ میری بات مان جائے۔

یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ مجھے تو دوسری زبان ملنے سے رہی لہذا
اُن کا دل بدل مے۔

یہ مطلب بھی عمل سکتا ہے کہ دونوں برابر کی درخواستیں ہیں، یعنی
یا میری زبان بدل مے یا اُس کا دل بدل مے۔ یہ کہنا وہ کر۔ بہر صورت
میری کچھ تو پذیرائی ہونی ہی چاہیے۔

یہ تشریح بھی ہو سکتی ہے کہ عات نے یہ شعر اپنے محبوب کے
مقلد نہیں بلکہ اپنے اُن معترضین کے متعلق کہا تھا جنہیں اُن کی زبان

مشکل ہونے کی شکایت رہتی۔ شاعر جل کر کہتا ہے یارب انہوں نے
(مسترضین نے) نہ اب تک میری بات سمجھی ہے نہ آئندہ سمجھنے کی توقع ہے
اسی صورت میں اگر میری زبان نہیں بولتا ہے تو ان کے دل ہی بدل سے
تاکہ ان پر میری بات کا اثر تو ہو۔

غالب کو اپنی بات کی نارمائی کا تو یہ شکوہ ہے لیکن دوسری
طرف اپنے محبوب کی بات کی اثر انگیزی کا وہ یہ عالم دکھاتے ہیں کہ
دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

غالب نے اس بات کی اکثر طرح طرح سے شکایت کی کہ ان کی بات
لوگ سمجھتے نہیں۔ کیسی اس کو اپنے وارفتگی سے تعبیر کیا ہے اور کبھی دوسروں
کی ناقدری سے جس کے متعلق اپنی نفرت آئینہ بے تعلقی کا ہر کی ہے کہ
آگئی دام شنیدن جس قدر ہے بھیلے درما عفتا ہے اپنے عالم تقریر کا

کہے ہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ کچھ نہ مجھے خدا کرے کوئی
کیا بیاں کر کے مڑاؤں گے یار مگر آشفستہ بیانی میری !
گر خامشی سے فائدہ اٹھانا حال ہے خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے
نہ متالش کی قنناہ صلا کی پرواہ گر نہیں ہیں مرا شمار میں معنی نہ سہی

استدار باب فطرت قدر دین مفذ و معنی ہیں
سخن کا بندہ ہوں لیکن نہیں مشتاق نہیں کا

ہر چند سبک دست ہوئے بشت کشی میں
ہم ہیں تو ابھی آہ میں ہیں سنگ گراں اور

مولانا مآکی نے اس شعر کے معنی یوں لکھے ہیں:۔ "اس شعر میں سارا
دور ہم کے لفظ پہ ہے یعنی جب تک کہ ہماری ہستی باقی ہے اس وقت تک
ماہ معرفت اکھی میں ایک اور سنگ گراں متواہ ہے۔ پس اگر ہم نے
بُت شکنی میں سبک دستی حاصل کر لی تو کیا فائدہ۔ یہ بڑا بھاری بُت عیسائی
ہماری ہستی تو ابھی موجود ہے"

بہت سے دیگر شارحین نے مولانا مآکی کی تشریح کی تائید کی ہے۔
"بُت شکنی" کے لفظ سے پہلے پہل ذہن اسی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ یہ شعر
معرفت اکھی میں کہا گیا ہے۔

بسا اوقات ہم بعض عقائد، توہمات اور تعصبات کے بھی ذہنی بخت
بن کر ان کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ ان عقائد، توہمات اور تعصبات کا
چھٹکارا اپنے کو بھی بُت شکنی کہا جاسکتا ہے۔

شعر کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے رجب شعر کے الفاظ یا معنوی بکے
کا فائدے کسی طرح کمزور یا مبہم نہیں ہے کہ اگرچہ ہم بیک فرسودہ عقائد
کے بتوں کو توڑ کر رسمی تقلید کے انحراف میں کافی ہمارت حاصل کر چکے
ہیں لیکن ہماری ہستی اپنے بشری تعاضنوں سے مجبور ہے اور وہ ہمارے
لئے نئے نئے عقائد کے بُت پیدا کرتی رہتی ہے۔ ہم ایک بُت توڑتے ہیں

تو دوسرا بنا بھی لیتے ہیں۔ ہم بُت شکن ہونے کے ساتھ ہی ساتھ بت تراش بھی واقع ہوئے ہیں۔ مضموم یہ کہ اگر ایک فلسفہ ہم ایک بات کی اندھی تقلید چھوڑ کر اپنی سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہیں تو دوسری فلسفہ اپنی فطری نادانی کے باعث کسی دوسری بات کی اندھی تقلید کرنا بھی شروع کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ پہلے ابا یان یورپ نسل اور مذہب کے عقائد کی بنا پر خونریزیاں کیا کرتے پھر انہوں نے ان اعتبارات کا بُت توڑ ڈالے لیکن ساتھ ہی ساتھ انہوں نے قومیت کا ایک نیا بُت بھی تراش لیا اور اب محض اس کی بنا پر پہلی اور دوسری جنگ عظیم ہو چکی ہیں۔ ہندوستان میں دیکھئے پہلے مغرب پرستی کو طرہ اعتبار سمجھا جاتا تھا، لیکن اب صدیوں سال پُرانے کلچر کو از سر نواپنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس قسم کے انتہا پسند رجحانات کے پیچھے معنویت غم اور مذہبیت زیادہ ہوتی ہے جو انسان کی بنیادی کمزوری ہے۔ شاعر غالب اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔



تو اور آرائش خیم کا کل

میں اور اندیشہ ہائے دو درواز

یہ شعر بڑا لطیف ہے اور اس میں غضب کی اشاریہ جس سے ذہن میں
طرح طرح کی تصویریں ابھرنے لگتی ہیں۔

تو اپنی زلفوں کے حلقوں کو سنوار رہا ہے اور میں مجیب مجیب اہوں
کا شکار ہو رہا ہوں۔ یہ واسطے کیا ہیں، ان پر بعض شارمین نے یوں
صبح آرائی کی ہے۔

حسرت موہانی : —————

”تیری آرائش میرے کمالِ محبت کا بامشہبے معنی تو
یہ سمجھتا ہے کہ مجھے گرفتار و قار کھنے کے لئے ہنوز آرائشِ ظاہری کی ضرورت
ہوتی ہے، حالانکہ میری محبت اس سے مستغنی ہے۔“

نظم طباطبائی : —————

”دیکھئے اب کون کون عاشق ہوتا ہے، کس کس عاشق کو یہ بناؤ
دکھا دیا جاتا ہے۔“

بخار و بلوی : —————

”دیکھئے کتنے نئے عاشق پیدا ہوتے ہیں اور کس قدر رقیبوں کا ہجوم
مجھ پر ہوتا ہے۔“

احمدی : —————

”یہ آرائش مجھ پر کیا کیا ستم کرے گی؟ یہ آرائش کر کے تو کہاں
جائے گا؟“

سکیم حبشی :

”یہ شعر ابھام اور اجمال کی بہت عمدہ مثال ہے اور ارباب ذوق جانتے
ہیں کہ یہ حبیبزں خزل کی جان ہیں، علاوہ ہر یہ خالصتہ تعاقب کی صفت
بھی پیدا کی ہے جس سے شعر کا لطف دو بالا ہو گیا ہے۔ کہتے ہیں تو اپنے
حسن کی آرائش میں مشغول ہے اور میرے دل میں مختلف قسم کے اندیشے
پیدا ہوئے ہیں مثلاً یہ کہ خدا معلوم تو کس کے لئے یہ بناؤ سنگار کر رہا ہے یا یہ کہ
خدا معلوم اب کون کون لوگ تجھ پر عاشق ہوں گے اور مجھے کیسے کیسے
مدد سے اٹھانے چڑیں گے؟“

اس شعر کا ایک پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ ایک تو ہے جسے اپنے حسن کو
سنوارنے ہی سے فرصت نہیں ملتی، تیری ساری زندگی صرف اپنی ذات
تک محدود ہو کر رہ گئی ہے، اور ایک میں ہوں جسے ہمہ وقت ساری خدائی کا
حکم کھلے جاتا ہے اور خود اپنا کوئی ہوش ہی باقی نہیں رہا ہے۔ معشوق
اور عاشق کی مصروفیتوں کا موازنہ کیلئے۔ غیر متبادل کلام کا ایک
شعر ہے۔

دشکے آرائشیں ارباب غفلت پر اسد!

نچو دتا بے دل نصیب خاطر آگاہ ہے!

تماشاے گلشن، تنائے چیدن بہار آفرینا! گنگا رہیں ہم

یہ شعر غالب کے متداول دیوان میں شامل نہیں ہے بلکہ نسخہء حمید
کی اشاعت سے منظر عام پر آیا ہے۔ اپنی اشاریت اور معنویت کے
کھاؤ سے عجیب و غریب مشرب ہے۔

عہدِ باری آسمانی نے اس شعر کے معنی یوں لکھے ہیں :- تملے بہار پیر کا
عالم! بے شک ہم تیرے گز گار ہیں اور یقینی تیرے حامی ہیں کہ تیرے
سوا ہم کو بچوں گھنے یا گلشن کے تماشے کی قنایہ ہے۔ ہم کو چاہئے تھا
کہ تیرے سوا اور کسی کی قنایہ نہ رکھتے !

پہلا مصرع بہت صاف ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم نے گلشن کا تماشہ کیا اور
کچھ بچوں کے چھنے کی قنایہ، مطلب یہ کہ ہم نے اس دیکھ بھولوں سے
بھر پور دنیا کو دیکھا اور اس کی کچھ دیکھ بھولوں میں حصہ لینے کی خواہش کی
(چونکہ بقدرِ حوصلہ حصہ نہیں لے پایا لہذا شاعر اس کو صرف حصہ لینے کی
خواہش سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کو اپنا فضل کہہ سکتے ہیں کہ کھانا مقصود ہے)۔
دوسرے مصرع کو پڑھتے وقت مستشرقین میں تھوڑا سا تفسیر پیدا کر دینے
سے کئی معنی نکل سکتے ہیں :-

بہار آفرینا :- گلشن کی رعایت سے بڑا جامع اور ساتھ ہی ساتھ بہت دلکش
لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ اشارہ بھی مقصود ہے کہ جب تو بہاروں کا

خان ہے تو تیرے لئے صرف گلشن کا تاشا اور پھولوں کے ٹہنے کی
تفنا کیوں موجب ناز منگی بن سکتی ہے! تیرے پاس کمی کیا ہے۔
اسی صاحب کے سنی صحیح تسلیم کئے جائیں تو اس لفظ سے یہ اشارہ بھی
ہو سکتا ہے کہ جب خود بہاروں کا خان موجود تھا تو پھر صرف گلشن کے
تاٹے وغیرہ پر تو بہ منتشر کیوں کی گئی؟

گنگار میں ہم :- کیا صرف اتنی سی بات پر تو ناراض ہو گیا۔ (تعجب)

ہے شک ہم گنگار ہو گئے۔ (اعتراض)

دیکھ تیرا گنگار حاضر ہے۔ (طنز)

ہم کو گنگار کون کہتا ہے۔ ہم سے کون سا ایسا گندہ سود ہو گیا اور ہتھنام لٹکاری؟

بس اتنی سی بات پر ہم تیرے گنگار ہو گئے۔ (تحقیر)

وہ اصل شاعر اس شعر میں اپنے (یا انسان کے) گناہوں کی بڑی مصوصیت کا

صفائی پیش کرتا ہے اور خدا سے ان کے متعلق درگزر کرنے کی استدعا کرتا ہے۔

ہم نے اس دیکھ پیوں سے بھر پور دنیا کو دیکھا اور بہ تعاضلے بشریت ہم نے

بھی کچھ دیکھ پیوں سے محظوظ ہونے کی کوشش کی، تو لے بہارا فرینا اس میں

کون سا ایسا غضب ہو گیا۔ کیا میں اتنی سی بات پر ہم گنگار ہو گئے! کیا تیری پیدا کی

ہوئی بہار پر ہمارا اتنا بھی حق نہیں کہ ہم اُسے دیکھ کر دُور سے خوش ہو سکیں؟ یا

اُس کے متعلق اپنے دل میں کوئی تنا کر سکیں۔

دعا ہے: "اگر اس شعر کو ملاحظہ کے اندر شعروں کی مدح میں چڑھا جائے تو کیسا ہے گا :-

در میان قمر و یاقوت بندم کردہ بازی گویا کردہ امن و ترنم ہزار باش

گند اگر ہم بندہ است یا را ملاحظہ تو در طریق ادب کو سنو، گونا گونا گوست

(عرشی)

سلطنت دست برد آئی ہے جام سے، خاتم جمشید نہیں

عام طور سے شاعریں نے اس شعر کی تشریح یوں کی ہے :-

”جام سے کی سلطنت جمشید سے رندوں کو دست برد آئی ہے۔ یہ

جام سے خاتم جمشید نہیں ہے کہ صرف جمشید ہی کے ہاتھ کے لئے مخصوص ہو اور
دوسرے اس سے محروم رہیں۔“

مفتی صاحب کو اس تشریح کے متعلق جزوی اختلاف ہے۔ کہتے ہیں :-

”سلطنت اور جام کو مراد مت قرار نہیں دینا چاہئے بلکہ یوں کہنا چاہئے

کہ سلطنت واسطہ بواسطہ مقلد ہوتی رہتی ہے۔ جام سے خاتم جمشید یا سلطنت

جمشید کو صرف ایک شخص کے لئے مخصوص ہو اور کسی کی ذات پر ختم ہو جائے۔“

پروفیسر سلیم چشتی صاحب نے اس شعر کے معنی یوں بتائے ہیں :-

”شاعر نے جام سے اور خاتم جمشید کا مقابلہ کیا ہے اور جام سے کی فضیلت

ثابت کی ہے۔ سلطنت کا جام سے یا سلطنت سے نوشی مراد ہے۔ کہتے ہیں

کہ جام سے مثل سلطنت ہے جو رندوں کو دست برد (کیے بعد دیگرے)

ہو چکا ہے۔ یہ خاتم جمشید تو نہیں ہے جس پر اسی کا نام کندہ تھا اور اس لئے

اسی کے پاس رہی۔“

میں اس شعر کا مطلب سمجھتا ہوں کہ جام سے خاتم جمشید نہیں ہے جو

کسی ایک شخص یا اس کے دربار کے لئے مخصوص ہو۔ یہ ایک سلطنت ہے جو

ہمیشہ اس کے اہل یا اس کے لئے جد و ہمد کرنے والے شخص کو نصیب ہوتی ہے۔ یہ ذرا حق نہیں بلکہ ہاتھوں ہاتھ ملتی ہے۔ یہ قناعت اور انتظار سے نہیں بلکہ آگے بڑھ کر جان کی بازی لگانے سے حاصل ہوتی ہے۔

جامی کے کو سلطنت کہہ کر غالب نے قیامت کی بات پیدا کر دی ہے اس کے کئی بڑے معنی خیز پہلو نکلتے ہیں۔

ایک سے کش جامی کے کو سلطنت کہتا ہے۔ جامی سے نصیب ہو جاتا ہے، تودہ جانتا ہے کہ مجھے دنیا بھر کی مکرانی مل گئی۔ اب جو میرے پاس ہے وہ کسی کے پاس نہیں۔

ایک سے کش شراب کے پیارے ہی کو اپنی سلطنت کہتا ہے اس کے حصول کے بعد اُسے دنیا کی کسی بات کی ہوس باقی نہیں رہتی۔ یہ اُس کا ختمائے زندگی ہے۔

جامی کے حصول کسی سلطنت کے حصول سے کم مشکل نہیں۔ اس کو پانے کے لئے بھی جان کی بازی لگانا دینی پڑتی ہے۔

جامی کسی کی ذاتی ملکیت نہیں۔ یہ ہاتھوں ہاتھ چلتا ہے۔ سلطنت کی طرح یہ صرف ہمت مردانہ اور جرأتِ رمانہ سے ملتا ہے۔

غالب نے شراب کو سلطنت کہہ کر ایک سے کش کے محدود زاد یہ نگاہ کی بھی نہایت دلآویز ترجمانی کی ہے، وہ دنیا کے سامنے کاروبار کو بچے کہتا ہے، اس کے لئے یہاں کی سب سے قابلِ قدر اور با اختیار چیز صرف شراب کا پیار ہے۔

جامے اپنے اپنے واسے کو تخیلات کی سلطنت بخش دیتا ہے۔ دغیر و غیر
 شراب کے موضوع پر غالب کے کچھ اور اشعار بھی ملاحظہ ہوں،
 جو عمر خیام کے لئے بھی قابل رشک ہو سکتے ہیں۔ سہ
 جاں فزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام آگیا
 سب لکیریں ہاتھ کی گویا رنگِ جاں ہو گئیں
 ہر چند کہ جو مشاہدہ حق کی گفتگو
 بنتی نہیں ہے بادہ و ساعشر کے بغیر
 گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
 رہنے دو ابھی سا فردینا مرے آگے
 پھر دیکھئے انداز گل افشائی گفتار :
 رکھ دے کوئی پیمانہ دھبہ مارے آگے
 مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
 اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے
 غالب پچھلی شراب پر اب بھی کبھی کبھی :
 پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں
 بہت سہی منہم گیمی شراب کم کیا ہے
 غلام ساقی کو خربوں مجھ کو غم کیا ہے

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

تعلیم صاحب اور آرتھی صاحب نے اس شعر کی بڑی مدح چسپ تشریح کی ہے :-

” ہر محبوب بناؤ سنگار اس لئے کرتا ہے کہ لوگ اُسے دیکھیں اور اُس پر عاشق ہو جائیں۔ چنانچہ ہمارے محبوب نے بھی خوب بناؤ سنگار کئے اور اپنے اس مطلب میں کامیاب ہوا۔ جب سارا جہان اس پر عاشق ہو گیا تو اس نے آرائش اشتیاق دیدہ کو مشغل کرنے کے لئے اپنے چہرے پر نقاب ڈال لی۔ نقاب ڈالنے کا اصل مدعا یہ ہے کہ کوئی شخص اُسے نہ دیکھے۔ جب کوئی اُسے دیکھتا نہیں تو پھر آرائش جمال کی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن ہمارے محبوب کو جمال آرائی کا اس قدر شوق ہے کہ باوجود نقاب ڈالنے کے اُسے آرائش جمال سے فراغت حاصل نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس شوق کو پورا کرنے کے لئے وہ پردے میں بھی آرائش جمال کے لئے ہر وقت آئینہ پیش نظر رکھتا ہے۔“

اس تشریح میں یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ یہ مضمون کہاں سے پیدا ہو گیا کہ محبوب نے پہلے چہرہ دکھا کر سامنے جہاں کو عاشق کیا اور پھر نقاب ڈال لی اور اب بلا ضرورت نقاب کے اندر آرائش جمال کو رہا ہے۔ یہ بھی سہی بات یہ کیوں نہ کہی جائے کہ ابھی نقاب اٹھا ہی نہیں ہے۔

وہاں نقاب کے اندر آرائشِ جمال کی جا رہی ہے اور جہاں مستحاکم اینڈ یہ نقاب اٹھتے کے انتہائی سرے جا رہے ہیں۔

حضرت ملّا علیاؒ اور حضرت تجوّد دہلویؒ نے اس شعر کا مطلب یوں سمجھا ہے :-

”نقاب استعارہ ہے حجابِ قدس کا اور آئینہ اس میں ”علم“ کا کیون
دماکان“ کا علم رکھتا ہے، اور آرائشِ جمال سے فارغ ہونا تفسیر ہے
”کلّ یوم مجوّنی شان“ کی ۱۱

سکیم چشتی صاحب نے اس شعر کا مفہوم یوں بتا دیا ہے :-

”بہت بلند پایہ شعر کہا ہے اور انداز بیان بھی بہت دلکش ہے۔ کہتے
ہیں کہ حق تعالیٰ اس کائنات کو پیدا کر کے فارغ نہیں ہوئے بلکہ وہ
ہر لحظہ فعلِ تخلیق یا اپنی ذات کی جلوہ گری میں مصروف رہتا ہے۔ یہ شعر
تشریح ہے اس آیت کی ”کلّ یوم مجوّنی شان“ یعنی اللہ تعالیٰ ہر لحظہ
اپنی ذات کی جلوہ گری میں مصروف ہے۔ غلامِ کلام یہ کہ اگرچہ خدا پہلے
میں ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے علمِ ازل کے مطابق ہر لحظہ نئے
نئے مظاہر میں ظاہر ہوتا رہتا ہے“

اس شعر کے مقلد ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری یوں رقم طراز ہیں :-

”مسکرات نقا کے مقلد ایک عجیب بات یہ ہے کہ ڈارون، سنسیر،

والس، ہیگل، دالین، منڈل وغیرہ نے تقریباً ایک ہی وقت میں ایک
دوسرے سے آزاد طور پر اس کا پتہ لگا لیا کہ ہر عہد کی ایک روح العصر

ہوتی ہے..... مرزا غالب نے بھی مسئلہ ارتقا کو پہچانا ہے۔ مرزا غالب نے اس بات کو کس نزاکت سے کہا ہے..... یعنی معشوق عالم جو موجودات کے نقاب میں پنہاں ہے برابر اپنی جہاں آرائی میں مصروف ہے اور آئینہ نقاب ہی میں لئے اپنے غامض کو درست کر رہا ہے۔ جب عالم تکمیل کو پہنچ جائے گا تو نقاب اٹھ دے گا۔ عالم کو دیکھنے سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کسی چیز کی کمی ہے۔ سشش جہت آراستہ ہو رہے ہیں اور منتظر ہیں ۛ

غالب کے اس موضوع پر دو شعرا ان کے قلم زدہ اشعار میں ملتے ہیں یہ
 عشق خود آرا کو ہے مشقِ تفاسل ہمو ز
 ہے کفِ مشاطہ سر میں آئینہ گُل ہمو ز
 ہے کفِ خاک، بگر نشہ صدر نگِ ظہور
 غنچے کے میکدے میں است تامل ہے بہار

کون کہتا ہے کہ غالب کا اپنے زمانے میں اپنی ناقدری کا شکوہ بجا تھا کس دل سے انھوں نے اپنے مندرجہ بالا شاہ کار قلم زد کر دیے ہوں گے؟ جس رقتِ روایتی شاعری کا طوطی بول رہا تھا اس قسم کے اشعار کو مغل اور حمل سمجھا جاتا اور ان کے لئے غالب کو داد و تحسین کے بہائے طعن و تشنیع کا سزاوار سمجھا جاتا۔

غالب کا بنیادی خیال یہ تھا کہ ابھی حسن کی کڑواہش کی تکمیل ہی نہیں ہوئی ہے۔ اس کے غنچے اور سنور نے اور خوب تر ہو جانے کا

سلسلہ دستور جاری ہے۔ اور یہ ترقی پذیر جلوہ سامانیاں پردے ہی پردے میں ہو رہی ہیں جن کی مشاقاں دید کو خبر بھی نہیں۔

شعر کا مطلب صرت یہ ہے اب اسے چاہے معشوق حقیقی کی طرف سے بلے چاہے معشوق مجازی کی جانب اور چاہے اس سے مسئلہ ارتقا اخذ کر لیجئے۔

نقاب کے مقلین غائب نے بعض بڑے پُر لطف اور دل پذیر اشارے کیے ہیں۔

اکبر! ہوا نقاب میں ہے اک کے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
ہے توری مہر مٹی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طست نقاب میں
منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
دلف سے بڑھ کر نقاب اس خوف کے منہ پہکھا
دا کر دیے ہیں شوق نے بند نقاب حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا
نظارہ نے بھی کام کیا داں نقاب کا
مستی سے ہر گھر سے رخ پر بکھر گئی

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار کیا پوچتا ہوں اُس بُتِ بیداگر کوئی

عام طور سے شارمین نے اس شعر کے معنی یوں بیان کئے ہیں :-

(۱) احمق لوگ خواہش کو پرستش قرار دیتے ہیں۔ بھلا خواہش اور پرستش ایک چیز کیسے ہو سکتی ہے۔ اس غلط فہمی کی بنا پر اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ میں اُس بُتِ بیداگر کی پرستش کرتا ہوں حالانکہ اس قدر افسوس کے ہلکے پرکس ہے، مجھے تو محض اس کی خواہش اور آرزو ہے، میں اس کا بھکاری نہیں ہوں۔

(۲) جب پرستش کی بجائے گی تو وہ خواہش دل ہی سے ہوگی، خواہ اس میں کسی قدر استعزاز کیوں نہ ہو، اور میں امر میں خواہش دل شامل ہو وہ عبادت نہیں ہو سکتی، تو ثابت ہوا کہ عبادت حق کوئی بجا نہیں لا سکتا صرف دنیا پابندان خواہش کو عابد کا خطاب دیتا ہے۔

(۳) مجھ تو دہلوی اور طباطبائی کا فرماتا ہے کہ معنی باریک اس شعر میں یہ ہیں کہ شاعر حیران ہو کر پوچھتا ہے، کہ کیا میں اُسے پوچھتا ہوں؟ اُسے خبر نہیں کہ معشوق کے سامنے باکر اظہارِ نیاز پرستش کی حد تک پہنچ جائے۔

(۴) اکثر مکتوبی کا اس شعر کے متعلق ارشاد ہے کہ شاعر کہتا ہے جسے

احمق (ظاہر پرست) پرستش سمجھتے ہیں، وہ دراصل میری خواہش پرستش ہے۔ پرستش کا مفہوم میرے ذہن میں اور ہوا کچھ ہے۔ ابھی اس کی تکمیل نہیں ہوئی مگر اس کا نام یہ اس قدر بلند ہے کہ خواہش پرستش پر لوگوں کو

پرستش کا دھوکا ہونے لگا۔

آخر لکھنوی نے خواہش کے معنی میں خواہش پرستش بنا کر شعر کو بہت محدود اور بے لطافت کر دیا ہے۔ کسی چیز کی بھی خواہش اس کے متعلق عل سے لازماً کم تر درجے کی ہوتی ہے، پھر شاعر نے اس شعر میں کون سی نئی بات کہہ دی ہے۔

اس شعر کے ایک معنی اور سمجھ میں آتے ہیں۔

شاعر کہتا ہے کہ احمق (حقیقت کے بے ہرہ) لوگوں نے اپنے فریضہ عہدیت کو اپنے اغراض کا پابند کر لیا ہے۔ ان کی عبادت بے لوث نہیں بلکہ میرے مطلب برآری کا ایک ذریعہ بن کر رہ گئی ہے۔

پہلے مصرعے میں وہ یہ دعویٰ کرتا ہے اور دوسرے مصرعے میں خود اپنی مثال سے اس کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔

خود مجھے دیکھو! میں جو اپنے معشوق کے اس قدر اظہار نیاز مند کی کیا کرتا ہوں تو کیا میں اُس بُت "کو جو" بیدادگر" بھی ہے؟ جتنا ہوں؟ ہرگز نہیں۔ اس کے سامنے میرا اظہار نیاز مند میرے اپنے اغراض کا تابع ہے۔ مطلب یہ کہ جو معاملہ میرے اور میرے معشوق کے درمیان ہے وہی کسی خواہش کے ماتحت عبادت کرنے والوں اور خدا کے درمیان ہے۔ اس کو حقیقی پرستش یا عبادت قرار دینا حماقت ہے۔

قالب نے اسی معنوں کو بار بار اور طرح طرح سے

کہا ہے۔

حاصلت میں تار ہے نہ مے دانگہیں کی لاگ
دورخ میں ڈال دو کوئی مے کر ہشت کر

کیا زہ کو مافوں کہ نہ ہو گر چہ ریا فی
پاداشیں مل کی طسچے غام بہت ہے

نیاز پردہ انھار خود پرستی ہے
جبیں سجدہ فشاں تہرے آستان تہرے

نیند اُس کی ہو، دماغ اُس کا ہو، راتیں اُس کی ہیں تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہو گئیں

عام طور سے شارمین نے اس شعر کی تشریح یوں کی ہے :-
”مرزا کا یہ شعر بیت الغزل اور نشتر کہلاتا ہے۔ شعر کا مفہوم یہ ہے
کہ جس کے ساتھ تو ہم خواب ہوا اور جوشِ اختلاط میں جس کے شانوں پر
تیری زلفیں پریشان ہو گئیں اُس کے دماغ کے کیا کہنے ہیں۔ نیند
اُس کی قابلِ رشک ہے۔ راتیں اُس کی خوش قسمت شخص کی صحیح معنوں
میں راتیں کہلانے کی مستحق ہیں اور جیسے یہ ماحل نہیں نہ اُس کا دماغ ہے
نہ نیند ہے نہ راتیں ہیں۔“

اقوامِ کفریہ نے اس شعر کی تشریح یوں کی ہے :-
”شعر میں نیند اُس کی ہے، کا کھڑا بہت لمبے اور ابہم ہے اس نے دسل
کو خواہشاتِ جہانی کی آسودگی سے مرتع کر کے روحانیت میں مبدل کر دیا
ورنہ دسل کا جو عام مفہوم ہے اُس میں نیند کہاں؟ بقولے ع
یار کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا“

نیند اُس کی ہے، اس بکرمے سے واضح ہوا کہ قربِ معشوق نے بے قراری
و اضطراب کا خاتمہ کر دیا۔ یہ حالت اُسی وقت تک تھی جب تک مظلوم ہوش
دسترس سے ابہر تھی۔ جب معشوق بل گیا تو سکونِ کامل میسر ہوا۔ اب نیند
اُس کی نیند ہے۔ دماغ اس کا دماغ ہے۔ راتیں اُس کی راتیں ہیں۔ خواب

میں بھی اور عالم بیداری میں بھی۔ شعر کی خیر مٹرک اور خاموش مصوری
 نے کہ معشوق کی آغوش اس کے شانے پہ کبھی بھرتی ہیں اور یہ معو
 خواب نوشیں ہے دو جسموں کا نہیں بلکہ دو روحوں کے مکمل باہمی جذب
 کا پیکر بنا دیا۔ عشق میں وصل کا یہی صحیح معیار ہے جس کو ہولہوسوں نے
 کیا ہے کیا بنا دیا ہے ۛ

خیر مٹرک اور خاموش مصوری کے ذکر پر غالب کے خیر متداول کلام
 کا ایک شعر یاد آ گیا ہے

گل کھلے، غنچے چھٹکنے لگے اور مسج ہوئی

سر خوش خواب کہ وہ زنگیں محمور ہنوز

شعر زیر بحث میں آخر صاحب نے نیند اٹھ کی ہے اسے جو نتیجہ
 نکالا ہے وہ صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن اسی کے ساتھ ملاحظہ کیجئے، اس کا
 ٹکڑا بھی بڑا سنی خیز ہے، اس میں کچھ بھی نہیں کہا ہے اور بہت کچھ کہہ دیا
 ہے۔ اب اپنا اپنا ذوق ہے کہ جو کچھ بھی سمجھ لیجئے، سکون کامل یا حسرت
 شباب کا ارمان انگیز اتصال۔

غالب کا کلام شاید ہے کہ غالب افلاطونی عشق کے قائل نہیں تھے
 بلکہ اُن کا عشق عام بشری تقاضوں سے بھرپور تھا۔ خیر متداول کلام کے
 دو بے پناہ اشعار ملاحظہ ہوں۔ ۛ

اسد ماں نذر الطافے کہ ہنگام ہم آغوشی
 زبان ہر سہرہ مو عالی دل پُر سیدی جانے !

اسد بندِ قبیلے یار ہے فردوس کا خلیفہ
 اگر وہاں ہو تو دکھلا دوں کہ یک عالم گستاں ہے
 متداول کلام میں بھی ان کے ردِ مافی نہیں بلکہ جہانی عشق کی بہت
 سی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً :-

مانگے ہے پھر کسی کو سب بام پر ہو سس
 زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے
 اک نو بہارِ ناز کو تار کے ہے پھر بچا
 چہرہ فردِ ناز سے گلستان کئے ہوئے
 دغیرہ دغیرہ
 فارسی کلام میں تو اس قسم کے اشعار کی اور بہتات ہے۔



ملنا تیرا اگر نہیں آساں تو سہل ہے دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

خود غالب نے اس شعر کا مطلب آقا مہدی عبد الباقی صاحب جوڑ
بریلوی کو یہ لکھ کر بھیجا تھا۔

”یعنی تیرا ملنا اگر آساں نہیں تو یہ امر مجدد پر آساں ہے۔ خیر تیرا
ملنا آساں نہیں نہ سہی، نہ ہم مل سکیں گے نہ کوئی اور مل سکے گا۔
مشکل تو یہ ہے کہ تیرا ملنا دشوار بھی نہیں، یعنی جس سے تو چاہتا ہے مل بھی
سکتا ہے۔ ہجر کو تو ہم نے سہل کر لیا تھا لیکن رشک کو اپنے اوپر آساں
نہیں کر سکتے۔“

مولانا جاتی نے اس شعر کے معلق لکھا ہے: ”ایک واقعہ کے بیان میں
ایسے مناسب محاورات کا دستیاب ہو جانا عجیب اتفاق ہے۔ اس
مضمون کو حقیقت کی طرف سے جاؤ اور چاہے مجاز پر محمول کر دو دونوں
صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ اگر تیرا ملنا آساں نہ ہوتا یعنی دشوار ہوتا
تو کچھ وقت نہ ہوتی اس لئے کہ ہم ہاؤس ہو کر میٹھے میٹھے اور شوق و آرزو کی غلش سے چھوٹ جاتے
مگر مشکل یہ ہو کہ جب ملنا آساں نہیں آتا تو دشوار بھی نہیں اور اسلئے شوق و آرزو کی غلش سے کیسے طرح
مولانا حسرت موہانی نے اس شعر کا مطلب یہ لکھا ہے: ”تخصیل امر
دشوار اگرچہ آساں نہیں ہوتی مگر ممکن ضرور ہے اور تخصیل امر محال سرے
سے ممکن ہی نہیں ہوتی۔ شاعر کہتا ہے کہ تیرا ملنا اگر آساں نہ ہو یعنی

دشوار ہو، تاہم سہل دآسان ہے مگر مشکل تو یہ ہے کہ دشوار بھی نہیں مہینہ
 محال ہے جس پر میرا کسی طرح قابو نہیں ۵
 مولانا حسرت موہانی نے اس شعر کے دو سکر معنی بھی لکھے ہیں اور
 قریب قریب وہی ہیں جو غائب نے لکھے ہیں۔
 اس شعر کے بہتر معنی تو وہی ہیں جو غائب نے لکھے ہیں، لیکن مولانا
 حسرت موہانی کے ادل الذکر معنی بھی لطف سے خالی نہیں۔ شاعر نے اس
 میں ایسے ہم معنی اور مستضاد الفاظ نہیں آسان، ”سہل“، ”دشوار“، ”دشوار“
 بھی نہیں، جمع کر دیے ہیں کہ شعر میں یقیناً ایک سے زیادہ مطالب کا امکان
 پیدا ہو گیا ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے ”دشوار بھی نہیں“ کے معنی ”محال“
 لئے ہیں جو ہرگز غلط نہیں کہے جاسکتے ہیں۔ ۶

(ماسطہ)

۵۔ مولانا حسرت موہانی کے معنی ہیں بہت بے پناہ فہم ۵

عرجی

پانی سے سگ گزیدے جس طرح اسد ڈرتا بول آئینے سے کہ مردم گزید ہوں

شعر زیر بحث اور اس غزل کے کئی اشعار بیاض طنائی سے منظر عام پر آئے ہیں۔

بظاہر اس شعر کے معنی بہت صاف ہیں۔ ایک عام خیال ہے کہ سگ گزیدہ انسان پانی دیکھ کر ڈرتا ہے کیونکہ اس پر یہ وہم طاری ہو جاتا ہے کہ وہ پانی میں اس کتنے کی صورت دیکھے گا جس نے اُسے کا متاع۔ شاعر اسی خیال اور وہم کی حریف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جس طرح کوئی سگ گزیدہ پانی سے ڈرتا ہے اسی طرح میں آئینے سے غافل ہوں کیونکہ مجھے انسانوں سے سخت تکلیف پہنچتی ہے میں آئینے میں جب اپنی صورت دیکھوں گا تو میری اپنے ہم جنسوں کے متعلق تلخ ترین یادیں تازہ ہو جائیں گی کیونکہ بالآخر میں بھی تو انہیں میں سے ایک ہوں۔

لیکن جس طرح غالب نے اپنے بعض لاجواب اشعار میں شوق میکشی لذت تقریر، ہجوم نا امید، جوہر اندیشہ، جذبات رقابت، وفور محبت وغیرہ کی انتہائی مدد و کمک پہنچ جانے کی بہت کامیاب کوشش کی ہے۔ اسی طرح اس شعر میں انہوں نے شدت نفرت کو اس انتہا تک پہنچا دیا ہے کہ بغیر انگشت بدندان رہ جاتا ہے کہ اب اس موضوع پر اس سے زیادہ اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ مجھ و موہانی نے غالب کی اس

خصوصیت کے متعلق دالہاء جوش عقیدے کا کہا ہے : ” مرزا (غالب) اکثر جس مضمون پر قلم اٹھاتے ہیں اُسے انتہا کو پہنچا دیتے ہیں۔ ہر پہلو پر نظر رہتا ہے اور کچھ اس طرح کہہ جاتے ہیں کہ اس کا جواب لگتے وقت نظر کر دگان قدرت ایسا دسپرا انداختہ نظر آتے ہیں۔ ہاتھ سے قلم چھوٹ پڑتا ہے۔ اجڑائے شعور بکھرے لگتے ہیں“

کسی بھی انسان کا دوسرے انسان سے نفرت کرنے کا بنیادی محرک کون ہوتا ہے ؟ اس کی اپنی ذات ! جس سے وہ قدرتا سب سے زیادہ محبت کرتا ہے، اور جو شخص بھی اس کی راہ میں مائل ہوتا ہے اُس سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اُسے انسانوں کے ہاتھوں ایسی بات بل برداشت تکلیفیں اور آذیتیں پہنچی ہیں اور اب اُسے ان سے اتنی بے پناہ نفرت ہو گئی ہے کہ دوسروں کی کیا وہ محض اس وجہ سے خود اپنی صورت تک دیکھنے کا روادار نہیں کہ بالآخر وہ بھی انسانی برادری ہی کا ایک فرد ہے۔ انسان کسی دوسرے سے نفرت کرتا ہے اپنی ذات کی وجہ سے۔ لہذا جب وہ دوسروں سے ایسی نفرت کرنے لگے کہ خود اپنی ذات کا بھی محض اس وجہ سے متنفر ہو جائے کہ وہ بھی انھیں کا ہم جنس ہے تو یقیناً یہ شدت نفرت کی آخری حد ہے۔



دیر و حرم آئینہ تکرارِ تمنا ! !
 واما ندگی شوق ترشے ہے پناہیں !

یہ شعر غالب کے غیر متداول کلام میں ہے لہذا متداول و پورا غالب کے شارحین نے اس کی تشریح نہیں لکھی ہے ۔

عبدالباری آجی صاحب نے اس کی شرح یوں فرمائی ہے ۔

”یہ دیر و حرم دونوں تکرارِ تمنا کے آئینے ہیں یعنی ان سے حال کھلتا ہے کہ شوق کو پھر تازہ کیا جائے اور پھر تمنا کا اعادہ کیا جائے گو یا کہ شوق کی واما ندگی کی پناہیں تلاش رہی ہے ، یعنی شوق جب تک جاتا ہے تو ان میں ایک میں واما ندہ ہو کر بڑھ رہتا ہے اور اس کا اپنی پناہ بنا لیتا ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ پھر کسی تمنا کا آغاز کیا جائے “

میں اس شرح سے کچھ نہیں سمجھا ۔ میں خود اس شعر کا مطلب یہ سمجھتا ہوں ۔

دیر و حرم ۔ بہت خانہ اور کعبہ ۔

آئینہ تکرارِ تمنا ۔ ایک ہی تمنا کی تکرار کا آئینہ ہیں یعنی ایک ہی خواہش ظاہر کرتے ہیں ۔

پناہیں ۔ جائے مافیت ۔ فضیلتیں ۔ حدیں ۔ منتائے مقصد ۔

کعبہ اور بہت خانہ ایک ہی تمنا یعنی تلاشِ حق کے دو منظر ہیں ۔

انسان اپنے شوق کی کوتاہی کے باعث انہیں کو اپنا منتائے مقصد یا جائے مافیت تسلیم کر بیٹھا ہے ۔ شاعر اس کمزوری کو قابلِ مذمت سمجھتا ہے ۔

انسان کے شوق یا نجس کی کوئی منزل نہیں ہونا چاہئے یا کم سے کم
دیر و حرم سے کہیں آگے ہونا چاہئے۔ لیکن چونکہ انسان میں طلبِ مادی
کی کمی ہے لہذا اس نے دیر و حرم کے مفروضات قائم کر کے انہیں کو اپنا
مایل زندگی سمجھ لیا ہے۔

اپنی ہستی اور کائنات کے اسرار و رموز کے معلوم کر لینے یا معرفتِ الٰہی
مایل کر لینے کے لئے انسان کی جستجو بے کراں رہے پناہ ہونا چاہئے تھی،
لیکن اس کے شوق کی کوتاہی نے اس کو اپنے ہی قائم کئے ہوئے چسند
مفروضات تک محدود کر دیا ہے اور اب ملا کی دوڑ مسجد تک کے مصداق وہ
انہیں کو اپنے فکر و عمل کی آخری حدیں مان بیٹھا ہے۔ یہ پناہیں یا حدیں جو انسان
نے ذہنی دستی اپنے ادبِ مستطاد و متعینہ کر لی ہیں اس کی کم مائی کا ثبوت ہیں۔
وہ اب ان سے آگے جاتے ہوئے ڈرتے ہیں حالانکہ شوقِ کامل کا تقاضا
یہی ہے کہ وہ ان کو توڑ کر آگے بڑھے اور اپنی تلاشِ حق کی کوششوں کو
لامحدود کرے، لاجواب شعریے، جس میں فکر و نظر کی آزادی پر زور دیا گیا ہے
منہی کی کثرت اور الفاظ کی قلت پر غور کیجئے زور یا کو کوئی سے بند کر دیا
ہے۔ ایک دو شعر شرم کہا ہے: ۱۔

ہے پرے سرِ صبرا دراکے اپنا مسجود قلب کو اہل نظر قبلہ بنا کہتے ہیں
غالبِ تعینات کے قائل نہ تھے ۲۔

منظر اک بلند ہی پہا در ہم بنا کہتے عرش سے ادھر ہوتا کاف کی مکاں اپنا

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

مولانا عاکی نے اس شعر کا مطلب یہ بیان کیا ہے۔

”اس شعر میں ازراہ تہذیب اُس کام کا ذکر نہیں کیا جس کے کرنے کے لئے مسجد، مدرسہ اور خانقاہ کو مساوی قرار دیا ہے۔ مطلب یہ کہ میکدہ جہاں حریفوں کے ساتھ شراب پینے کا لطف تھا جب وہی چھٹ گیا تو اب مسجد میں مل جائے تو، اور مدرسہ و خانقاہ میں ہاتھ آجائے تو، سب جگہ پی لینے بجا رہے۔ مسجد وغیرہ کی تخصیص ازراہ شوخی کی گئی ہے، یعنی یہ مقامات جو اس شغل کے بالکل لائق نہیں ہیں وہاں بھی میکدہ چھٹنے کے بعد پی لینے سے انکار نہیں ہے اور شراب پینے کی تصریح نہ کرنا عین مقتضائے بلاغت ہے۔“

اس شعر میں غضب کا تیکھا پن اور ظرافت ہے۔ میکدے کے نشاط انگیز ماحول میں ساتی کے ہاتھوں اور دوسرے ہم مشربوں کے ساتھ پینے اور پی کر ہلکے بلے کا لطف ہی کچھ اور تھا، مگر جب میکدے کے دروازے ہم پر بند ہو گئے اور ہم سے ہماری جنت جھن گئی تو پھر اب ہم جہاں بھی چاہے گا اپنا غم غلط کرنے کے لئے پی لیں گے۔ ایک طرف تو یہ مغلوبیت اور مصیبت اور دوسری طرف یہ شوخی اور ستم ظریفی کہ اب پینے کا ارادہ کہاں ہے صبح مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

اس شعر میں میکدہ ٹھٹھانے والوں پر ایک چوٹ بھی ہے۔ ان کو ٹا کر

شاعر کہتا ہے میکدہ تو چھڑا دیا لیکن میکشی کی عادت کب چھوٹتی ہے۔ پہلے ہمارا گناہ میکدے کی چار دیواری میں محدود تھا اب وہ مسجد، مدرسہ اور خانقاہ جیسے مقدس مقامات تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ ضنا شاد یہ ہے کہ ہم کو میکدے ہی میں شراب پینے کے لئے چھوڑ دیتے تو زیادہ بہتر تھا۔ اب وہاں سے نکالا ہے تو دیکھو ہماری شراب نوشی کیا رنگ لاتی ہے۔ اور ہم کیسی کیسی جگہوں کو ناپاک کرتے ہیں۔

شعر سے ایک دو سطر طنزیہ پہلو بھی نکلتا ہے۔ جب میکدہ چھوٹنے کے لئے سب سے زیادہ موزوں جگہ ہو سکتی تھی، چھٹ گیا تو اب کیا ہے کہیں بھی پی لیں گے۔ پھر اب اس فکر میں کہ کہاں پینا چاہئے شاعر باؤں بلند سوچتا یا اپنے آپ کے کہتا ہے: اچھا تو اب پینے کے لئے مسجد، مدرسہ یا کوئی خانقاہ زیادہ مناسب ہے گی۔ غالباً اس وجہ سے کہ ایسے پاکیزہ مقامات پر بیکر شراب پئیں گے تو وہاں کوئی ہم پر ایسی مذموم حرکت کرنے کا مشکل ہے اسے سببہ کر سکے گا۔ واعظوں کے لئے عج چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند۔ مسلمات شاعری میں سے ہے۔



وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا!
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستان کیوں ہو؟

عام طور سے شاعرین نے اس شعر کا مطلب یوں بیان کیا ہے :-
کیسی وفا اور کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا تو اے سنگ دل
تیرا ہی سنگ آستان ہونا کیا ضرور ہے۔ جہاں مجا پا ہے گا سر پھوڑ لیں گے۔
اسی مطلب کو پیش نظر رکھ کر غالباً ا کا ارشاد ہے :-
”یہ شعر رنگ و سنگ میں گوہر شاہوار ہے“
اسی فرماتے ہیں :-

”اس شعر کی بندش میں وہ چپی ہے جس کی تعریف غیر ممکن ہے“
پروفیسر سلیم چشتی کا خیال ہے :-

”بچہ تو یہ ہے کہ بندش کی چسپائی، الفاظ کے انتخاب، دوسرے
صعرات کے تھوڑا زبان کی خوبی اور معنوں کی دل کشی کی بدولت یہ شعر
سحر حلال کے مرتبہ کو پہونچ گیا ہے۔ یہ الفاظ دیگر یہ شعر غالب کے نشرو
میں ہے۔ شاعرین کے علاوہ غالب کے تمام شائقین بھی اس شعر کی
معنویت کے معترف ہیں“

اس شعر کے طرزاں میں غنیمت کی بے ساختگی اور ٹھیکاپن ہے اور
اس کاغذ سے اس شعر کی جو کچھ بھی تعریف کی جائے وہ بالکل مسح اور
درست ہے۔ اوپر بیان کئے ہوئے مطلب میں جس بات نے شاعرین کو

سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ شاعر کی شانِ خردماری اور بے نیازی ہے اپنی عزت نفس کی خاطر وہ اپنی دقا، عشق اور معشوق سے بھی دستبردار ہونے کو تیار ہے، لیکن اس مطلب کی روشنی میں شعر کے اس ٹکڑے "جب سر پہنڈنا ٹھہرا" کی حسبِ درخواست وضاحت نہیں ہوتی۔ کیا سر پہنڈنا شاعر کی صفتِ جبلّیٰ مادہ ہے؟ اور کسی سے عیش کی اضطراری کیفیت نہیں؟ اس سے تو شعر کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شاعر (عاشق) جھنجھلا کر اب دقا اور عشق دونوں سے مدد پر مجبور اور متغیر ہو چکا ہے، لیکن چونکہ اپنے سر پہنڈنے کی جبلّیٰ مادہ ہے لہذا معشوق کو طعنہ دیتا ہے کہ ہمیں سر پہنڈنے کے لئے تھروں کی کیا کمی ہے۔ تیرا سنگ آستان نہ سی کوئی اور سی۔ ہمیں تو بس سر پہنڈنے سے مطلب ہے۔

میرے خیال میں اس شعر کا ایک دوسرا مطلب بھی ہو سکتا ہے جو پہلے مطلب سے کہیں زیادہ لطیف، پُر طعن اور شعر کے الفاظ پر حاوی ہے، اور وہ طرّا داد کے باگپن اور اشاریت میں اور بھی چار چاند لگا دیتا ہے۔

معشوق، عاشق کو طعنہ دیتا ہے کہ تم میں نہ کوئی دقا ہے اور نہ مجھ سے عشق کرنے کی کوئی صلاحیت۔ تم تو محض ایک دیوانے ہو جو اپنے عالمِ دیوانگی میں میرے سنگ آستان سے اپنا سر پہنڈتے رہتے ہو۔ عاشق صادق اس شعر میں معشوق کی اس جلی کٹی کا بہت دل برداشتہ ہو کر بڑا طنز جواب دیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے عیش کا ایک انتہائی مُکمل ثبوت پیش کر کے اگلے کو لا جواب کر دیتا ہے۔

مشتوں ہی کے ادا کئے ہوئے الفاظ ”وفا کیسی؟“ ”کہاں کا مشت؟“
 دہرا کر عاشق یہ مفہوم ادا کرتا ہے۔ اچھا تو ابھی تک تجھ کو ہماری وفا اور
 عشق کا بھی اعتبار نہیں آیا؟ اور ہم تیری نظر میں صرف عالم دیوانگی میں
 تیرے سنگ آستان سے اپنا سر چھوڑتے رہتے ہیں۔ مگر اسے سنگ دل
 پھر اس کا جواب تیرے پاس کیا ہے کہ ہم دنیا کے تمام حسینوں کو نظر انداز
 کر کے صرف تیرے ہی سنگ آستان پر اپنا سر کیوں چھوڑتے رہتے ہیں؟
 تجھ سے ہیں عشق نہ ہوتا اور ہم صرف عالم دیوانگی میں اپنا سر چھوڑتے پھرتے
 تو کسی بھی جگہ اُسے چھوڑ سکتے تھے۔ اس کے لئے صرف تیرا ہی سنگ آستان
 کیوں مخصوص ہوتا۔

ہاں مانتی بڑی دنیا کو چھوڑ کر صرف تیرے ہی سنگ آستان پر سر
 چھوڑنا تجھ سے ہمارے عشق کا ایک ناقابل انکار ثبوت ہے۔ پھر ہماری وفا
 اور عشق کے متعلق تیرا انکار ہے اعتباری تیری نادانی نہیں تو اور کیا ہے؟



نقص میں مجھ سے روداد چھپن کہتے نہ ڈرہم گری ہو جس پہ کل بجلی وہ میرا آشاں کیوں ہو

یہ شعر خیال، زبان اور بیان پر قدرت کا ایک نادر شاہ پارہ ہے اگر غور کیجئے کہ شاعر نے کیا بات کن الفاظ میں اور کس انداز سے کہی ہے تو اُس کی جادو بیا نی پر ایمان لے آنا پڑتا ہے۔ یہ شعر نفسیات کے ایک باریک کتنے کا حامل اور انتہائی پُر تاثیر اور دردناک ہے۔ یہ ایک نقص بند کے لئے صرف ہمدردی نہیں بلکہ اس کی ذہنی کیفیت اور ہر قسم کی عکاسی کر کے ایک صبر انگیز نضا بھی پیدا کر دیتا ہے۔

حضرت مہاتما بانی لکھتے ہیں: "اس قدر معانی ان دو مصرعوں میں سما گئے ہیں کہ ان کی تفصیل یہاں لفظ سے خالی نہیں۔ ایک طائر مہین نشین سے جتنا ہو کر اسیر ہو گیا، اس مضمون پر صرف ایک لفظ 'نقص' اشارہ کر رہا ہے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے بارغ میں بجلی گرتے ہوئے دیکھی ہے اور نقص میں متردد ہے کہ نہ جانے میرا آشاں نہ بچا، یا جل گیا۔ ان تمام معانی پر فقط 'کل' کا لفظ دلالت کر رہا ہے۔ ایک اور طائر جو اس کا ہم صنف اور ہمدم ہے وہ سامنے کسی درخت پر آ بیٹھا ہے اور اسیر نقص نے اُس سے روداد چھپن کو دریافت کرنا چاہا ہے مگر اس سبب کہ اُسی کا نشین جل گیا ہے، طائر مہین نشین فصل مال کہتے ہوئے پس و پیش کرتا ہے کہ اس اسیری میں نشین کے جلنے کی خبر کیا سناؤں۔ اس تمام مضمون پر فقط یہ جملہ

دلالت کرتا ہے کہ 'مجھ سے رو دو' میں کہتے نہ ڈر ہدم ۱

"علاوہ اس کثرت معانی کے اس مضمون نے جو دو سکرمصرے میں ہے واقعہ کو کیا درد ناک کر دیا ہے معنی جس گرفتار قفس پر اسی تازہ آفت اور پلائے آسانی نازل ہوئی ہے اُس نے کیا اپنے دل کو بھرا کر طعن کر دیا ہے کہ باغ میں ہزاروں آشیانے ہیں کیا میرے ہی خیمین پر بجلی گری ہو گئی یہ حالت ایسی ہے کہ دیکھنے والوں کا اور سُننے والوں کا دل کڑھتا ہے اور ترس آتا ہے اور یہ ترس آجاتا وہی اثر ہے جو شعر نے پیدا کیا ہے ۵

مجھے بتا دیجائی کے بیان کردہ مطالب کے سلسلے میں صرف ایک بات یہ عرض کرنا ہے کہ شعر زیر بحث میں ایک بڑا مصرعہ آرا لکھو "درد ہدم" بھی ہے، اس سے جہاں ایک طرف یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ہدم بات کہتے ڈر رہا ہے، وہاں دوسری طرف اُس کی اس اضطرابی کیفیت کا یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کل جہن میں جو بجلی گری تھی وہ طائر قفس بندھا کے آشیانے پر گری تھی اور اس سلسلے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی، ورنہ شعر مبہم اور بے اثر ہو جاتا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اپنے بدترین اندیشوں کے باوجود طائر قفس بندھنے کا بھی کو پوری بات بتانے کے لئے لکھا رہا ہے۔ غالباً اُمید کی کوئی مدد بھی جوت اُس کے دل کو گرا رہی ہے۔

شاعر نے طائرِ امیر کی نا اُمیدی اور مایوسی کی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے نا اُمید اور مایوس انسان ہمیشہ اپنے متعلق بُری سے بُری ہی بات سوچتا ہے

یہاں بھی طائرِ اسیر کے دل میں چور ہے کہ کل جو بجلی گری ہے وہ یقیناً میرے
 ہی نشین پر گری ہوگی لیکن پھر وہ تھوڑی ہی دیر کے لئے اپنے آپ کو تسلی
 دینے کے لئے کہتا ہے کہ یہ کیا ضرور ہے کہ وہ ہمیں کے اتنے بہت سے نشین
 چھوڑ کر میرے ہی نشین پر گری ہو۔ لیکن السوس کہ یہ تسلی بھی دیر پا نہیں
 ہو سکتی کیونکہ جہوم اس سے رو دا دھپن کھتے ڈر رہا ہے۔ اور یہ ڈر صاف
 اشارہ کر رہا ہے کہ اس کے جہزین خدیشہ حقیقت بن چکے ہیں۔

شعر کے تیور بتا رہے ہیں کہ یہ جلا گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا
 آشاں کیوں ہو؟ طائرِ اسیر کے منہ سے عالمِ باس و ہراس میں صرصر
 ہدم کو سنانے کے لئے نہیں بلکہ خود اپنے آپ کو دھمکیاں دینے کے لئے
 بے ساختہ نکل گیا تھا۔



ہے بزمِ بتاں میں سخنِ آزرده لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامدِ لبوں سے

مختلف شارحین نے اس شعر کے جو مختلف مطالب بیان کئے ہیں ان کی بنیاد ہے سخنِ آزرده لبوں سے اور دو مصرع میں لفظ "ایسے" کے مفہوم پر ہے۔ میں انہیں مختصراً درج کرتا ہوں :-
ہے سخنِ آزرده لبوں سے :- قوتِ گویائی نے لبوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔
بات کرنے کا بھی نہیں چاہتا۔
بات کرنے کو لب ترستے ہیں۔
سخن لبوں سے روٹ گیا ہے۔

ایسے :- اس قدر۔ اتنا زیادہ (مطلب یہ کہ تنگ آنے کی حد تانا منظور ہے)

اس قسم کے۔ اس طرح کے (مطلب یہ کہ خوشامدِ لبوں کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ لبوں کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے)۔
آؤ کہنوی نے اس شعر کا مطلب یوں بیان کیا ہے :-

"لفظ بُت کے دو معنی ہیں۔ ایک تو معشوق اور دوسرے خاموشی۔

غالب نے ان دونوں معنوں کو ذہن میں رکھ کر مضمون پیدا کیا ہے۔ چونکہ بُت خاموشی کہتے ہیں اور اسی میں اپنا وقار سمجھتے ہیں، لہذا ان کی طوطا کا بہترین طریقہ یہی ہے اور ان کی خوشنودی اسی میں مقصور ہے کہ ان کے

سامنے خاموش بیٹھے رہے اور بقولے 'خاموشی از شنائے تو صد شنائے تو' پر
کار بند ہو جائے۔ ادھر عشق ہم کلام ہونے، ہاں پڑوسی کہنے اور عرض و نیاز
و شرح آرزو کا متمنی۔ شوق تقاضائے گفتار کرتا ہے، مگر جنوں کی مرضی
کہ لب آشنائے تکلم نہ ہو، سُننے میں گھٹنیاں بھرے بیٹھے رہو، کیا شوخی
ہے، سادگی میں کس قدر پُرکاری و ستم فریبی ہے۔ غالب اگتا کہ چسپ
اُٹھتے ہیں کہ ہائے ایسے خوشامد طلب معشوق جو خاموشی کے سوا اور کوئی
طریق خوشامد پند نہ کریں اور اس طرح عاشق کو تڑپائیں اور ترسائیں ۛ

باقی صاف نے، بیان غالب میں اس شعر کی تشریح یوں کی ہے۔
"خوشامد طلب معشوقوں سے ہم ایسے تنگ آئے ہیں کہ سخن بیوں
سے آزرده ہو گیا ہے۔ گویا ان کی محفل میں اب بات چیت کرنے کو بھی
ہمارا جی نہیں چاہتا ہے کہ میں اس کی خوشامد کروں تو وہ لب تک آئے۔ گویا
رحب سخن سے معشوق کے سامنے بات بھی سُننے سے نہیں بکھتی ۛ

پروفیسر سلیم چشتی نے اس شعر کا مطلب یوں بیان کیا ہے ۛ "چونکہ دنیا
میں خوشامد پسندوں کی کثرت ہے اس لئے ہم ان لوگوں سے اس درجہ
تنگ آچکے ہیں کہ معینوں کی محفل میں بھی (مالا لک و محفل تھیں ہے) کچھ
کہنے یعنی حسین کی خوشامد کرنے کو معنی اُن کے حسن و جمال کی تعریف کرنے
کو جی نہیں چاہتا ۛ

نیا ز فہم پوری نے اس شعر کو یوں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔
"اس شعر کے کہنے میں عام طور پر یہ غلطی کی جاتی ہے کہ بیوں سے

سخن کی آزدگی کو خود غالب سے متعلق سمجھا جاتا ہے اور اس طرح مختلف تاویلیں کی جاتی ہیں حالانکہ اس کا تعلق جنوں سے ہے اور مفہوم یہ ہے کہ بزم جاں کا یہ حال ہے کہ وہ کوئی بات ہی نہیں کرتے اور چاہتے یہ ہیں کہ ان کی خوشامد کی جائے تو وہ کچھ بولیں۔ اس لئے ہم ایسے خوشامد طلبوں سے سخت تنگ آ گئے ہیں۔

شکر کا بہت سا مفہوم یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ہم خوشامد طلب معشوقوں سے ایسا تنگ آ چکے ہیں کہ ان کی محفل میں ہمارا بات کرنے کو بھی نہیں چاہتا یا ان کی محفل میں ہم بات کرتے بھی ہیں تو آزدگی اور بیزاری کے ساتھ یہ مطلب بھی نکل سکتا ہے چونکہ ہم جنوں کی خاطر خواہ خوشامد نہیں کر پتے لہذا اپنی محفل میں وہ ہم سے بڑی آزدگی اور بیزاری کے ساتھ گفتگو کرتے رہا چنانچہ ہم ایسے خوشامد پسندوں سے اب تنگ آ چکے ہیں۔

حاشیہ ۱۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم بزم جاں میں ہم اس لئے جاتے ہیں کہ حال دل سنا کر انہیں ماننے اور پرہیزان کر دیں گے۔ وہاں پہونچ کر بات ہو جنوں سے روٹ جاتی ہے، یعنی قوت گوئی ساتھ میں دینی دیکھتے ہیں جہاں بات جلتی ہے (یعنی) اور ہم لو کہ لا کھ آسے ملتے ہیں (یعنی) بات کرنے کی سعی کو پیش کرتے ہیں، مگر وہ کسی طرح نہیں ہوتی۔ اب کوئی بتاؤ کہ ایسے خوشامد طلبوں (یعنی قوت گوئی) سے کس طرح عہدہ برآ ہوا جائے۔ ہم تو اس کے باوجود سخت تنگ آ گئے ہیں۔

۲۔ انہی کو بھی تو ہمارا ساتھ دے کہ ہم اپنے مشقوں سے اپنا حال دل کہہ سکیں۔

اس شعر کے ساتھ شعر میں سامنے رکھئے گا۔

آج ہم اپنی پریشانی خاطر ان سے کہتے جاتے تو وہی پر دیکھتے کیا کہتے ہیں

طرح ہے کہ ہر جتنا زیادہ مدعا کرتا ہے، وہ اتنا ہی زیادہ خوشامد طلب ہوا کرتا ہے۔

فرغی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

حضرت اکبر لکھنوی نے اس شعر کے معنی یوں بیان فرمائے ہیں :-
 شعر کا پس منظر یہ ہے کہ معشوق غالب کی موجودگی میں اُن کو سنا کر
 کہتا ہے کہ غیر کو مجھ سے محبت ہے۔ یہ امر (غیر کی محبت) ایسا بدیہی ہے کہ
 معشوق کے مزاج و غالب چکنا چوتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ اس بظاہر
 سادہ غیر متعلق بیان کی تہ میں کوئی نہ کوئی فریب ضرور ہے۔ کوئی چال
 چل ہے۔ غور کرنے سے انکشاف ہوتا ہے کہ اس سادگی میں غضب کی ہر کاری
 ہے اور بات بہت دور تک پہنچتی ہے۔ معشوق کا یہ قول محض سنانے یا
 جملانے کے لئے نہیں ہے بلکہ صرف عاشق کی آزمائش ہے۔ یہ جک دینا
 چاہتا ہے کہ میں بھی مل کر اور مشتعل ہو کر ادعا کے عشق کروں اور ایسے
 فعل کا سرکلب ہوں جو خلاف شیوہ عاشقی ہے، کیونکہ معشوق سے بالاعمال
 عشق جتنا ابوالہو سکا کے مراد ہے۔ عشق اگر صادق ہے تو دل کی خبر دل
 کو ہوتی ہے۔ خود بقول غالب عجب پریش ہے اور پائے سخن در میان ہیں۔
 غالب پر معشوق کا مافی الضمیر تو روشن ہو گیا، اب دوسری صدمہ درپیش ہوئی
 کہ جواب کیا دیا جائے۔ خاموش رہتے ہیں تو حاضر جوابی ہی پر حرف نہیں
 آتا بلکہ نکتہ میں معشوق آگے بگولا ہو کر کہے گا کہ اس کی بات کو ناقابل
 اعتنا سمجھا اس کا نسا اُس کا ن اُٹا دیا۔ کھٹکھٹا جواب دینا آدابِ عشق

و شانِ محبت دونوں کے مٹانی ہے۔ جواب دیا ہی بہم ہو جیسی معشوق کی بات گنم ہے۔ زکی بہ ترکی ہو۔ لہذا مستعد راتا کہتے ہیں کہ ”ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے“ جواب کی اہمیت اور بلا غلت شعر کی ردیعت ہی سہی میں گمراہ ہے۔ اس نے غیر کے قول کی تکذیب کر دی اور اس کی محبت کو مشتبہ بنا دیا۔ غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی کا مطلب یہ ہوا کہ ہیں یقین نہیں کہ غیر کو تجھ سے محبت ہے، مگر یہ فرض کرتے ہوئے بھی کہ اس کو تجھ سے محبت ہے۔ اس طرح وہ پہلو بھل آیا جس پر زور ہے رہا تھا۔ غیر عاشق نہیں بلکہ ہوا لہوس ہے دردا اعلان محبت یا اقرار محبت نہ کرتا۔ اسی کے ساتھ معشوق پر یہ چھپنا آگیا کہ تو ایسا سادہ لوح ہے کہ اس کی بات کا یقین آگیا، یہی نہیں بلکہ تجھ سے بھی متوقع ہے کہ غیر پر رشک کروں اور جینے سے ہزار ہو جاؤں یا اسی کی طرح ہے غیرت بن کر تجھ سے محبت جتاؤں تاکہ اسی طرح تیری نظر میں ذلیل ہو جاؤں۔ تو صاحب میں ایسی کچھ گویاں نہیں کیلا ہوں نہ میں غیر کی طرح تنگ نظر ہوں۔ منٹا یہ پہلو بھی بھل آیا کہ میرے عشق میں غیر کے علی الرغم خلوس ہے۔ نیز یہ بھی اشارہ ہو گیا کہ تجھے بھی غیر کی محبت کے بے کوٹ ہونے کا یقین نہیں در نہ تجھ سے چھپاتا۔

اقر صاحب کی معنی آفرینیاں اپنی جگہ پر بہت جاذب توجہ اور دلکش ہیں لیکن انہوں نے شعر کو ایک چھپتا بنا دیا ہے اور شعر سے زیادہ اس کا مطلب سمجھنا دشوار ہو گیا ہے اور پھر حاصل شعر کیا نکلا؟ ”عاشق کا جواب دیا ہی بہم ہو جیسی معشوق کی بات گنم ہے“ بالکل وہی بات جیسے

دو گونے ایک دوسرے سے اپنے خواب بیان کر رہے ہوں اور تماشائی حیرت سے ان دونوں کا مکھ تک رہے ہوں۔ مودبانہ عرض کروں گا کہ غلبہ کا یہ انتہائی صاف اور سادہ شعر اقرصاحب کی نکتہ منجیوں کا کسی طور سے متحمل نہیں ہوتا۔ اس کی سادگی اور پرکاری میں اس کے مطلب کے زیادہ طرز ادا کا دخل ہے۔ میں اس کے معنی یہ سمجھتا ہوں :-

”معشوق عاشق سے کہتا ہے کہ تجھے نہیں بلکہ غیر کو مجھ سے محبت ہے عاشق طرح طرح سے اپنی محبت کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ لیکن معشوق ماننا ہی نہیں اور غیر ہی کی محبت کا دم بھرتا رہتا ہے۔ بالآخر جب کوئی دلیل کارگر نہیں ہوتی تو اتمام محبت کے لئے کہتا ہے ”اچھا ہم تیرے کہنے سے یہ ماننے لیتے ہیں کہ غیر کو تجھ سے محبت ہے لیکن خدا را اس پر تو ذرا غور کر کہ اگر میں تجھ سے محبت نہیں تو کم از کم خود اپنے آپ سے تو عداوت نہیں ہو سکتی تھی پھر ہم نے جو اپنی ساری زندگی تباہ و برباد کر کے اپنی یہ حالت زار بنا رکھی ہے تو کس لئے؟ کیا ہماری صورت حال ہماری محبت کا ناقابل تردید ثبوت نہیں؟ عاشق کی زبانوں عالی مقام شاعری میں سے ہے۔ مثلاً یہ پہلو بھی نکالتا ہے کہ غیر کے محض کہہ دینے سے کہ اُسے محبت ہے معشوق اس کی محبت کا گردیدہ ہو گیا، لیکن میں جو معشوق ہر اپنا سب کچھ مٹائے بیٹھا ہوں مگر زبان سے کچھ بھی نہیں کہتا تو وہ میری محبت کا قائل ہی نہیں ہوتا۔ اقرصاحب کا یہ فرمانا کہ معشوق سے بالا اعلان عشق جتنا برا ہو سکا کے مراد ہے صحیح نہیں ہے، خود غالب نے صاف صاف کہا ہے :-

- ۴۔ جان تم پر فشار کرتا ہوں
- ۵۔ تجھے کس منشا سے ہم دیکھتے ہیں وغیرہ وغیرہ
- آجی صاحب نے اس شعر میں یہ نکتہ نکالا ہے کہ ۱۔
- ”غیر کو تجھ سے محبت ہے تو سہی، ہم بھی جانتے ہیں مگر ہم بھی تو دشمن نہیں ہیں، ہم بھی تو اپنے ہی ہیں، ہم کو بھی تجھ سے محبت ہے پھر ہم کو اس کے مقابلے پر ذلیل کیوں سمجھا جاتا ہے؟“
- لیکن شاعر کا اگر یہ مضمون ہوتا تو پہلا مصرع بقول اثر صاحب۔
- ۶۔ ہم بھی دشمن تو نہیں، اپنے ہیں۔ ہونا نہ کہ
- ۷۔ ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے۔
- غیاث تنچہ پوری کا خیال ہے کہ اس شعر میں غالب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ”ملو مان لیا کہ غیر کو تم سے محبت ہے لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ مجھے محبت نہیں ہے۔ کیونکہ تجھ سے میرا نہ محبت نہ کرنا خود اپنے آپ سے دشمنی کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی شخص آپ اپنا دشمن نہیں ہو سکتا۔ غیر کا تجھ سے محبت کرنا تو صرف لطف محبت کے لئے ہے۔ لیکن میرا محبت کرنا تو میری مجبوری ہے کیونکہ وہی میری زندگی ہے“

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کو خوش رکھنے کو غالب خیال چھپا،

اثر کلکسوی نے اس شعر کے معنی یوں بیان فرمائے ہیں :-
”غالب جنت کے نہیں بلکہ عام تصور جنت کے منکر ہیں۔ یہ کوئی مخصوص
جائے اسائش نہیں بلکہ قرب کی منزل ہے۔ نفس مطمئنہ کی ایک کیفیت ہے۔“
پروفیسر سلیم چشتی کا اس شعر کے متعلق یہ خیال ہے :-
”ہم جانتے ہیں کہ دراصل جنت کا کوئی وجود نہیں ہے لیکن دل کے
خوش رکھنے کو یہ خیال بہت اچھا ہے کہ دنیا میں جس قدر تکلیفیں اٹھائی ہیں
اُن کا نعم الہی جنت میں مل جائے گا۔ بالفاظ دیگر با نیا ن مذہب نے سادہ
لوگوں کو سبز باغ دکھایا ہے۔“
الفاظ کے معمولی تغیر کے ساتھ دیگر شارحین نے بھی قریب قریب یہی
معنی بتائے ہیں۔

میری رائے میں اس شعر کا جو مطلب سمجھا جاتا ہے یعنی جنت کے اعتقاد
پر طنز اس کے پیش نظر لفظ ”لیکن“ کا استعمال پر عمل نہیں ہے۔ اس کے
بجائے کوئی دوسرا لفظ جیسے ”یعنی“ یا ”بے شک“ وغیرہ آسانی سے
رکھا جاسکتا تھا۔ غالب الفاظ کے انتخاب میں بڑے محتاط اور نکتہ رس
واقع ہوئے تھے۔ اور پھر اسے معرکہ آرا شعر کے متعلق وہ ہرگز لاپرواہ نہیں
ہو سکتے تھے۔ پہلے مصرع میں اس ٹکڑے ”ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت“

کے بعد لیکن، کے صرف یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ شاعر جنت کی حقیقت سے انکار نہیں کر رہا ہے بلکہ اُسے اُس کے متعلق کوئی بات اور بھی کہنا ہے۔ شعر کی نثر کی جائے تو یہ ہوگی: ”ہم کو جنت کی حقیقت معلوم ہے لیکن دل کو خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے“ اور اس سے اس کا مطلب یہاں نہیں نکلتا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس شعر کا مفہوم سمجھنے میں اس کو پڑھنے کے لیے کا بڑا دخل ہے؛ لیکن، کے بعد شاعر نے کچھ بات محذوف مقدار کر دی ہے۔ ”ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت“ کے بلند آہنگ دعوے کے بعد۔ ”لیکن،“ کہہ کر شاعر ٹھوڑی دیر کے لیے سکوت اختیار کر لیتا ہے اور شعر کے عام مفہوم کے تحت اس سے کئی پہلو نکال آتے ہیں مثلاً

ہم کو جنت کی حقیقت معلوم ہے (یعنی وہ کچھ بھی نہیں محض ایک اچھے ہے) لیکن..... اس کو بدلنے سے فائدہ؟ یا ہماری سُننے کا کون؟ یا مذہبی عقائد کو نہیں لگے گی یا عوام کا ایک سہارا ختم ہو جائے گا یا کار خیر کی تحریک ختم ہو جائے گی۔ ہم کو جنت کی حقیقت معلوم ہے (وہ مادی آسائش کی جگہ نہیں ہے) لیکن..... نامہ حراس سے مادی آسائش کی توقعات مٹا دے بیٹھا ہے، ہماری بات پر کب کان دھرے گا۔

ہم کو جنت کی حقیقت معلوم ہے لیکن..... ہم جانا نہیں چاہتے اور نثر یہی کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ دل کو خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔ وغیرہ وغیرہ اور اس طرح شاعر کچھ نہ کہنے کی آڑ میں بہت کچھ کہہ رہا ہے، یعنی جو لوگ ہماری جیسی بصیرت نہیں رکھتے اُن کے لئے جنت کے متعلق سبز باغ والا روایتی تصور یا مذہبی خوش فہمی ہی مناسب ہے۔

موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بن آئے نہ بنے
تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ تو بکرائے نہ بنے

اس بظاہر آسان سے شعر کے ساتھ یہ ساخچ پیش آیا کہ بیشتر شارمین نے دوسرے مصرعہ کا سوالیہ نشان نظر انداز کر کے "تم کو چاہوں؟" کے ٹکڑے کو بعد کے ٹکڑے سے الگ نہیں کیا۔ اس کے بعد دونوں مصرعوں میں مشکل ہی سے کوئی ربط باقی رہ جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود شارمین نے شعر کا مطلب بیان کرنے کی جو کوششیں کی ہیں وہ مطلقاً غالی نہیں۔

مولانا حسرت موہانی،

"موت کی راہ دیکھنے سے کیا فائدہ کہ وہ تو خواہ مخواہ آئے ہی گئی۔

تمہاری خواہش کرنا چاہتے ہیں کہ اگر تم نہ آؤ تو مجھے بھلاتے بھی نہ بن پڑے؟

نظم صاحب ابائی،

"موت کی راہ کیوں نہ دیکھوں کہ وہ آئے بغیر نہ ہے گی، یہ مجھ سے نہیں ہو گا کہ تم سے کہوں تم نہ آؤ کہ پھر مجھے بھلاتے بھی نہ بن پڑے یعنی اب میں آنے کو منع کروں تو کیسے سکے سے بھلاؤں۔ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ تمہارے نہ آنے سے موت کا آنا بہتر ہے۔

یحزادہ دلوی،

موت کی میں کیوں راہ دیکھوں اس کا آنا لازمی ہے وہ بغیر انتظار کے

بھی اپنے وقت معین ہوا کرے گی۔ تم کو چاہوں کہ اگر تم نہ آؤ تو ہمارا بلا نا بھی ممکن نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارا بلا نا موش کے آنے سے دشوار تر ہے ۛ

آسی

تیرے چشب درد و موت کا انتظار کرتا ہوں یہ فضول ہے وہ تو خواہ مخواہ آئے گی اور اس کے یقینی ہونے کا سبب اور اس کو بھانسنے کی تدبیر یہ ہے کہ میں یہ چاہوں یعنی اس بات کی خواہش کروں کہ تم نہ آؤ تو اس خواہش کا لازمی نتیجہ یہ نکلتے گا کہ مجھ سے ناراض ہو جاؤ اور پھر تمہارے ٹپے گا کہ میں تم کو بھلاؤں اور پھر اس سلسلے سے لادھا مجھے موت آ جائے گی ۛ

مصدقہ

”میرے اوپر شب انتظار میں جو کلفت ہے وہ صرف دوسروں کے رخ ہو سکتی ہے یا تم آؤ یا موت لیکن تمہاری کیفیت یہ ہے کہ اگر نہ آؤ تو میں بکا بھی نہیں سکتا۔ اس لئے تمہاری آمد کو کیوں چاہوں اور موت ہی کا راستہ کیوں نہ دیکھوں کہ وہ اس تکلیف میں یقیناً آکر رہے گی ۛ

اسی طرح دوسرے شعراء میں نے بھی اس شعر کا مطلب بیان کرنے سے زیادہ اس کو مطلب پنہانے کی کوشش کی ہے۔

دوسرے مصرعے میں تم کو چاہوں کے بعد سوا الی نشان سے شعر کا مطلب بالکل واضح ہو جاتا ہے اور شعر کے دونوں مصرعوں میں کسی قسم کی کوئی بے طبعی

یا اہنام باقی نہیں رہتا۔

عاشق صادق کے لئے عشق کی آخری منزل پر دو ہی باتیں مانتی رہ جاتی ہیں موت یا معشوق۔ اور چمکے معشوق کا طعنا موت کے آسنے سے زیادہ مشکل نظر آتا ہے۔ لہذا وہ موت ہی کو ترجیح دیتا ہے۔ ماحصل کلام یہ کہ جب معشوق کے حصول کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تو اس کے فراق میں انگاروں پر لوٹنے کے بجائے عاشق اپنی موت کی تمنا کرتا ہے۔ اس تمنا میں کم سے کم یہ اطمینان ضرور رہتا ہے کہ یہ پوری ضرور ہوگی کیونکہ میر کا کبھی نہ کبھی آنا لازمی اور لا بدی ہے۔ غالب دیر بجھت شعر میں یہی بات اپنے معشوق کو بھلاتے ہیں کہ تمہاری تمنا کرنے سے تو موت کی تمنا کرنا زیادہ بہتر ہے۔ تمہاری تمنا کا تو کوئی حاصل نظر نہیں آتا تو موت کی تمنا میں یہ بھر دوسرے تو شریک حال ہے کہ وہ کبھی نہ کبھی آ ہی جائے گی۔

موت کی راہ نہ دیکھوں؟ آخر میں موت ہی کا انتظار کیوں نہ کروں اس کے انتظار میں کم سے کم یہ اطمینان تو ہے کہ وہ بغیر آئے نہ رہے گی۔ اس کی تمنا کرنے کا مقصد کبھی نہ کبھی تو پورا ہو جائے گا۔ اس کے مقابلے میں تمہاری تمنا میں کیوں کروں؟ تم نہ آنا چاہو تو پھر میری کیا مجال جو تم کو بلا سکوں۔ تم اپنی زندگی کے سامنے کسی کی ٹھننے ہی نہیں۔ موت سے یہ توقع ہے کہ وہ جلدی یا بہ دیر کبھی میری خواہش ضرور پوری کرے گی لیکن میں تم سے تمہارے برتاؤ کی وجہ سے ایسی کوئی توقع باقی نہیں رہی ہے۔ لہذا میں اب تمہاری تمنا کیوں کروں؟ صبر و شکر سے موت ہی کا

انتظار کیوں نہ کروں ؟

خود غالب نے اس شعر کا بھی مفہوم اپنے ایک دوست منشی نسیب بخش
 حقیر کو لکھا تھا۔ شعر کا مابل یہ بنایا تھا کہ "گو یا یہ عاجز معشوق سے
 کہتا ہے کہ اب میں تم کو چھوڑ کر اپنی موت کا عاشق ہوا ہوں، اس میں
 خوبی یہ ہے کہ جن بکلائے، بغیر آئے نہیں رہتی"۔



قیامت ہے کہ ہوئے مدعی کا ہم سفر غالب!
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جا رہا مجھ سے

غالب کے اس شعر کے متعلق آؤ لکھنوی صاحب کا خیال ہے کہ وہ
تیسرے اس شعر سے متاثر نظر آتا ہے۔

عشق ان کو ہے جو یار کو اپنے دم و مستن
کرتے نہیں غیر صفا خدا کے بھی حواسے

کسی کے لئے یا اچھے خیال سے متاثر ہونا کوئی عیب نہیں ہے بلکہ
اگر اس خیال کو ترقی دے کر بہتر طریقے سے پیش کر دیا جائے تو یہ ایک بہتر
سہ ہے۔ علاوہ اذیل مجھے اس خیال سے بھی اتفاق نہیں کہ غالب کا شعر تیسرے
کے شعر کی عکاسی کرتا ہے۔ دونوں میں مستند مشق کو خدا کے حواسے کرنے
کا خیال مشترک ہے ورنہ دونوں ہی میں بالکل مبدا گانہ باتیں کہی گئی
ہیں۔ تیسرا اور غالب کے زمانے میں یہ مجلسی آداب میں داخل تھا کہ اپنے
کسی عزیز پر یا دوست کو رخصت کرتے وقت ”خدا کے سپرد کیا“ کہنا
کرتے۔ لہذا مشق کو خدا کے حواسے کرنے کا خیال بہت عام اور پیش
پا افتاد تھا اور اس کے لئے کسی کو کسی کی عکاسی کرنے کی مطلق ضرورت
نہیں تھی۔ دیکھنا ضرور ہے کہ اس عامۃ الورد و خیال کو بنیاد بنا کر
تیسرے نے کیا کہا ہے اور غالب نے کیا کہا ہے۔ تیسرے اس کے متعلق پہلے
کہا تھا لہذا یہی دیکھنا چاہیے گا کہ غالب نے اس کو بہتر صورت میں

اور ترقی دے کر کہا ہے یا نہیں۔

تیسرے شعر میں 'خدا کے حوالے کرنے' کے خیال سے متعلق بنیادی الفاظ 'عشق' اور 'غریب' ہیں۔ 'عشق' کے معنی محبت کے علاوہ شاباشی کے بھی ہیں۔ تیسرا اُن چاہنے والوں کو شاباشی دیتے ہیں یا قابلِ تعریف سمجھتے ہیں جو اس غیبت میں کہ اپنے معشوق کو کسی دوسرے کو کیسے سونپا جائے اُس کو رخصت کرتے وقت خدا کے سپرد کرنا بھی گوارا نہیں کرتے معشوق کے معاملے میں اُن کا احساس ملکیت اس قدر مستحکم ہے کہ وہ خدا کو بھی غیبت سمجھتے ہیں اور معشوق کو اس کے بھی سپرد کرتے ہوئے انہیں غیبت محسوس ہوتی ہے۔ شعر میں 'غریب' کا لفظ ایک حیثیت کا بہت خوب استعمال ہوا ہے لیکن دوسری حیثیت سے اس نے شعر کے معنوم کو محدود بھی کر دیا ہے۔ مطلب یہ کہ معشوق کو خدا کے حوالے کرتے وقت صرف مہذبہ غیبت مانع آتا ہے۔

غالب ایک ڈرامائی صورت حال پیش کرتے ہیں۔ کیسی قیامت کی بات ہے کہ ان کا معشوق اُن کے رقیب کا ہم سفر بن رہا ہے۔ وہ اس صورت حال کو کیسے برداشت کر لیں جب وہ اس 'کافر' کو خدا کے سپرد کرنا بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے؟ 'کافر' کا لفظ یہاں پرالہامی اورلاجواب ہے۔ 'کافر' کو خدا کے سپرد کیا جاسکتا اچھا جواب نہیں دیتا۔

معشوق کو خدا کے سپرد نہ کئے جانے کی جو تاویل تیسرے پیش کی تھی یعنی معشوق کے معاملے میں عاجز کا احساس ملکیت اس قدر شدید ہوتا ہے کہ

وہ خدا کو بھی غیر سمجھتا ہے، اور اس کو خدا کے سپرد کرتے ہوئے بھی غصہ مند محسوس کرتا ہے، یہ بات تو غالب کے شعر میں بہتر اور ترقی یافتہ انداز بیان کے ساتھ موجود ہی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی اس میں غضب کا رمز و کنایہ پایا جاتا ہے۔ معشوق کے خدا کے سپرد نہ کئے جانے کے کئی اور بھی وجوہ اخذ کئے جاسکتے ہیں۔ ایک بڑی شوخ اور جیسا کہ بلکہ دریدہ دہنی والی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میرا معشوق ایسا تو پر شک اور غارت گرا یاں ہے کہ اس کے متعلق دنیا کے کسی متقی اور پرہیزگار پر کیا خود خدا تک پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تیر کا شعر حوا اپنی جگہ پر کافی رنگین اور پُر لطافت نظر آتا ہے، غالب کے بھرپور اور پہلو دار شعر کے مقابلے میں بہت پیکا پڑ جاتا ہے۔ تیر نے 'غیرت' کو درمیان میں لا کر سرت ایک پہلو پر نظر رکھی اور ان عاشقوں کو جو اُسے غیرت کے اپنے معشوق کو خدا کے بھی حواس نہیں کرتے محض شاہی دینے پر اکتفا کی ہے۔ غالب نے صرت زیر بحث خیال کے ہر پہلو پر حادی ہو جاتے ہیں بلکہ پس منظر میں ایک ڈرامائی صورت حال بھی چٹائی کر دیتے ہیں جو ان کے شعر کو کہیں سے کہیں پہونچا دیتی ہے۔ کافر اور خدا کے الفاظ کے ساتھ 'قیامت' کا لفظ بھی خوب استعمال ہوا ہے۔ سخن معنی کے علاوہ سخن بیان میں بھی تیر کا شعر غالب کے شعر سے بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔

غالب قابل سرزنش نہیں بلکہ لائق تحسین ہیں کہ انہوں نے تیر جیسے بگڑا روزگار کے اچانکے ہوئے معنوں پر بھی طبع آزمائی کی تو اُسے فرش سے فرش پر پہونچا دیا۔ نقل اور حکایتی کرنا یقیناً آسان ہے لیکن کسی

شہ پائے کے مقابل اس سے بڑھ چڑھ کر دوسرا شہ پارہ پیش کر دینا عسرت
ہست و دشوار پسند ہی کا کام ہو سکتا ہے۔

میں شاعروں کے مدارج مقرر کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ کسی چمن میں
جا کر ہر پھول کے رنگ و بو اور حسن سے مخلوق ہونے کے بجائے اگر کوئی
شخص اس کاوش میں لگ جائے کہ کون پھول کس سے بہتر یا بدتر ہے
تو یہ بے مذاقی نہیں تو اور کیا ہو گا؟ میں خود غالب سے سب سے زیادہ متاثر
ہوا ہوں لیکن ساتھ ہی ساتھ میں میر تقی میر کے نشروں کا گھامکی اور
ان کے مرتبہ شاعری کا معترف اور معتقد ہوں اور جو لوگ ان کو غالب پر
ترجیح دیتے ہیں ان سے متفق نہ ہوتے ہوئے بھی ان کو خلوص نیت کا پورا
فائدہ دینے کے لئے بھی تیار ہوں۔ البتہ اس وقت تعجب مندر ہوتا ہے
جب اکثر دلائل کے بجائے ان حضرات کی جانب یہ کہا جاتا ہے کہ خود
غالب نے اپنے اوپر میر کو ترجیح دی تھی اور اس کے جواز میں یہ شعر پیش کیا جاتا ہے،

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بہ قول ناسخ

آپ بے بس رہے جو معتقد میر نہیں

غالب یقیناً میر کے مداح اور معتقد تھے۔ میر تو خیر ان کے پیش زور و بزرگ
اور ایک مسلم الثبوت استاد تھے وہ ذوق، مومن، ناسخ، آذر وہ اور
شیفۃ وغیرہ اپنے ہم عصر شاعر ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کے بھی مداح اور
معتقد تھے اور جو کہ ہوتا اس سے بلا تکلف بے بہرہ سمجھتے۔ ذوق کے لئے
ایک دفعہ بہت جمل کر کہا تھا

راست می گویم من داور ہست و نواں کشید

ہر چہ در گفتار فخر است، آں ننگ من است

لیکن انہوں نے اپنے خطوط میں اکثر ذوق کے اشعار کہے ہیں اور ان کی تعریف بھی کی ہے، اور اسی طرح انہوں نے اپنے دیگر ہم عصروں کی تعریف و توصیف میں کبھی کبھل سے کام نہیں لیا۔ معنی صدر الدین آرزوہ کے لئے تو یہاں تک لکھ دیا تھا۔ ع

آں کہ ننگ اوست بودن اور سخن ہوتا ہے من

ایک وسیع المنظر فن کار کے لئے ضروری نہیں کہ وہ صرف سراپنے سے بہتر ہی فنکار کا معتقد ہو۔ وہ اپنے ہم پلہ یا اپنے سے کم تر فن کار کا بھی معتقد ہو سکتا ہے۔ معتقد ہونے کے معنی صرف اعتراف کمال ہیں نہ کہ بطور شاگرد دانوئے ادب ذکر کرنے کے، کسی کے کمال کے اعتراف کہلے یہ قطعی نتیجہ بھی نہیں نکلتا ہے کہ معترف اس کا ہم مذاق بھی ہے اور اس کمال کو حاصل کرنا یا اس کی پیروی کرنا اپنے لئے ضروری بھی سمجھتا ہے۔

غالب کی شاعری میں ہیں یقیناً ایک ایسا دور ملتا ہے جب وہ میر تقی میر کے سادہ اور پُرکار حسن بیان سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں لیکن ان کے اور میر کے افتاد مزاج اور زندگی کے اقدار کے شعور میں بہت بڑا فرق تھا۔ وہ اس دور سے بہت جلد آگے بھٹ گئے، فنی فنی بخش و حقیر کو یہ غزل

سب کہاں، کچھ، لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ نہاں ہو گئیں

بھی تو اس کے ساتھ یہی لکھا "خدا کے واسطے، داد دینا، اگر ریختہ یہ ہے تو تیرا دروازہ کیا کہتے تھے؟ اگر وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ہے؟" اور اسی طرح حقیر کو ایک دوسری غزل بھیجتے ہوئے لکھا "داد دینا، کہ اگر ریختہ پایہ سحر یا عجاز کو پہنچے تو اس کی بھی صورت ہو گئی یا کچھ اور؟"

ان بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ موضوعات سخن سے قطع نظر غالب انداز بیان اور خصوصاً سہل متعین کہنے میں بھی اپنے کلام کو تیسرے کے کلام پر ترجیح دیتے تھے، لیکن اس سے یہ غلط فہمی ہرگز نہ پیدا ہونا چاہئے کہ وہ حقیر کے معقد یا معترف نہیں تھے۔

ریختہ کے عشقیں استاد نہیں ہو غالب
سنئے ہیں اگلے زمانے میں کوئی تیسرے کا



نشہ شاداب رنگ ساز ہا مست طرز شیشہ سے سرو سبز جو ببار نغمہ ہے

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری نے اس شعر کے متعلق لکھا ہے :-

”جو لوگ کہ گرم معتدل فرش ارض پر رہنے کے عادی ہیں، وہ ان لوگوں کی پاک اور خوف آمیز مسرت کو کیا جان سکتے ہیں جو فنون لطیفہ کی سرد اور بے داغ برص کا ڈھکی ہوئی مریض چٹوٹیوں پر گشت لگا رہے ہیں۔ کاف نے خوب کہا ہے کہ ہمسکے اشعار ایسے ہوتے ہیں جن میں آزاد حسن ہوتا ہے۔ وہ پھولوں کی طرح اپنے معنی نہیں بیان کرتے بلکہ اپنی خوشبو سے مشام جان کو مسرور کرتے ہیں۔ اگر ان کی نشر کرنے اور ان کے مطالب دریافت کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ کوشش ایسی ہوگی جس طرح کوئی شخص پھولوں کی خوشبو کو پانے کی مرض سے ان کی چٹوٹیوں (سپیکٹر ٹیوں) کو توڑ کر علیحدہ کرے۔ بعض اوقات انسان پر ایک کیفیت طاری ہوتی ہے کہ اس کیفیت میں خواب کی سی حالت ہوتی ہو قوت تخیل ادراک پر غالب آجاتی ہے اور محجب پر لطیف پریشان مطلب مظاہر پیش کرتی ہے۔“

غالب نے کونخل کی طرح شاداب اور ساز کو مے گسار کی طرح مست بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شیشہ سے سرو و نغمہ کے جو ببار یہ ایک سرو سبز ہے۔

”بودیر BAUDELAIRE کہتا ہے شاعرانہ کیفیت میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب تمام حواس نہایت درجہ تاثرات پذیر اور ذکی اکھس ہو جاتے ہیں..... جملہ اشیائے عالم اپنی صورت کا بسا اوقات دوسری صورتوں میں منتقل ہو جاتی ہیں، آوازیں رنگین معلوم ہونے لگتی ہیں اور رنگ میں نغمہ پیدا ہو جاتا ہے، غالب کو نشہ شاداب اور ساز مست اور نغمہ آب رواں اور جام سرور سبز نظر آتا ہے“

سلیم چشتی نے اس شعر کا مطلب یوں بیان کیا ہے۔

”شراب کے نشے میں رنگینی اور سرور ہے، ساز و نور سر سے مست ہے
یعنی شراب میں نغمہ کی اور نغمہ میں شراب کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اور شبیہ
سے کیلے ہو گیا ایک سرور ہے جو نغمے کی ندی کے کنارے اگلا ہوا ہے یعنی
اپنی بار بار دکھا رہا ہے“

نیا ذمہ پوری کا اس شعر کے مطلق ارشاد ہے۔

”غالب نے اس شعر میں محفل طرب کی سرٹ نفاط کا تذکرہ کیا ہے کہ ہر
شخص نشے میں چور ہے۔ بطریوں کے سارے مستی ٹپک رہی ہے۔ شبیہ
شراب رو نظر آتا ہے اور نغمہ جو بار کی طرح جاری ہے“

کئی شاعرین نے اس شعر کو مطلق اور بے معنی قرار دیا ہے لیکن کم سے کم
اُردو شاعری اور خصوصاً غزل میں یہ شعر اپنی نوعیت کا ایک انوکھا شعر ہے
شاعر نے اپنے لطف و انبساط کی کیفیت کو تاثر و تشبیہات میں ایک محب اغاز
سے بیان کیا ہے۔ اس کیفیت کو سمجھا جاسکتا ہے بیان نہیں کیا جاسکتا۔

شبہم بہ گل لالہ نہ خالی زاد ا ہے
داغ دل بیدر د نظر گاہ حیا ہے

پروفیسر یو سٹک لیم شجی نے اپنی شرح دیوان غالب میں اس شعر کے معلق عجیب و غریب تنقید کی ہے :-

چونکہ اس شعر میں غالب نے اپنے مفہوم کو ان الفاظ سے ادا کیا ہے جن سے وہ مفہوم ظاہر نہیں ہوتا اس لئے شعر معلق ہو گیا اور یہ اخلاق ہی "غالب ازم" یعنی اُن کی خصوصیت ہے :-
اس کے بعد شعر کا مطلب یوں لکھا ہے :-

"جب گل لالہ نے اس بات پر غور کیا کہ میرے دل میں داغ تو ہے مگر وہ نہیں یعنی یہ داغ حقیقی نہیں بلکہ مصنوعی ہے تو اُسے شرم محسوس ہوئی جس کی وجہ سے وہ عرق عرق ہو گیا، الفاظ دیگر سے لوگ شبہم کہتے ہیں وہ دراصل عرق خجالت کی بوندیں ہیں :-
چشتی صاحب نے اس شعر کے معلق ہونے کی جو وجہ بتائی ہے -

" غالب نے اپنے مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے جن سے وہ مفہوم ظاہر نہیں ہوتا اس لئے شعر معلق ہو گیا :- وہ بالکل غلط ہے - اگر کسی شعر سے کوئی مطلب ہی نہیں نکلتا تو وہ معلق نہیں بلکہ مہمل ہے اور اگر نکلتا ہے تو شارح کو مستعدہ مطلب بیان کر دینا چاہیئے اور اس شعر لغزسانی کی ذمہ داری اپنے سر نہ لینا چاہیئے کہ وہ حقیقت شاعر کو نہ کیا چاہتا تھا۔

معلق تو ہم صرف اس شعر کو کہہ سکتے ہیں کہ جس میں شاعر نے اشاروں اور کناؤں سے کوئی بات کہنا چاہی ہو یا کسی سچیدہ اور دورازکار مضمون کو پیش کرنے کی کوشش کی ہو یا غیر اس سبب ضرورت پڑنے پہلے دعویٰ کی بنیاد رکھی ہو اور اس طرح اپنے مافی الضمیر کو بعید از فہم بنا دیا ہو۔ غالب کے در بحث شعر میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ نظم کبابی، حسرت موہانی، تجوید موہانی، آخر لکھنوی، نیا زنجبوری، آتشی وغیرہ جیسے صاحب علم و ادب نے اس شعر کی شرح لکھی ہے اور کسی نے اس کو معلق نہیں قرار دیا ہے بلکہ بیشتر نے اسے قابل تھکین سمجھا ہے۔

یہ ٹکڑا کہ ”اعلان ہی غالب ازم یعنی غالب کی خصوصیت ہے۔“ نہ صرف حقیقت سے بعید بلکہ دیوان غالب کے ایک شارح کے منہ سے تعجب خیز ہے۔ کسی مشکل مضمون کو بیان کرنے کے لئے بے اوقات مشکل الفاظ ہی کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ غالب قابل صد آفریں ہیں کہ انہوں نے عام روش سے ہٹ کر نازک اور پیچیدہ مضامین پر طبع آزمائی کی اور اس سلسلے میں اگر انہیں مشکل الفاظ استعمال کرنا پڑے تو وہ اس کے لئے مجبور تھے۔ انہوں نے محض مشکل الفاظ سے مضمون کو دقیق نہیں بنایا بلکہ دقیق مضمون کے لئے مشکل الفاظ استعمال کئے ہیں۔

عبدالباری آتشی صاحب نے ان کے اس قسم کے کلام کے لئے فرمایا ہے۔
 ”یہ وہ کلام ہے جو مرزا کو عوام کی صفت سے علیحدہ کر کے زمرہ خواص میں لے آتا ہے اور ان کی تخیل کی رفعت کا اندازہ کرتا ہے اور

ان کی دستِ نظر کی شہادت دیتا ہے ۵
 ”غالب ازم کو“ غالب کی خصوصیت“ بتاتا دیا ہی ہے جیسے
 پنج بادیاں کی جڑ کھتا۔

شعر زیر بحث میں خاص ٹکڑے حسب ذیل ہیں :-
 نہ خالی نہ ادا ہے :- ادا سے خالی نہیں ہے۔ بے مطلب نہیں ہے۔
 کوئی خاص معنی رکھتی ہے یا نشان دہی کرتی ہے۔
 دل بے درد :- دل جو درد سے خالی ہے (آخر کھنڈی نظم عبا بانی
 اور دیگر شاعرین)۔

سنگ دل :- جسے دوسروں کی مصیبت پر ترس نہ آئے۔
 (بجود موہانی)

نظر گاہِ حیا :- حیا کی نظر پڑنے کی جگہ۔ باعثِ ندامت۔ قابلِ شرم
 (تمام دیگر شاعرین)

اُمید گاہِ حیا :- جس سے حیا کی اُمیدیں وابستہ ہوں۔
 (بجود موہانی)

بجود موہانی نے اس شعر کا مطلب یوں لکھا ہے کہ لالہ پر اُدس
 کی پوئیں یہ مطلب ادا کر رہی ہیں کہ بے دردوں کے داغ ہی سے حیا
 کی اُمیدیں وابستہ ہیں..... یعنی جب بے درد خود کوئی صدمہ اُٹھاتا
 ہے تو اس کو عاشقوں یا مظلوموں کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے۔ اور یہی
 احساس اس کو اپنے گزشتہ بے دردانہ طرزِ عمل پر شرمندہ کرتا ہے اور

جوشِ ہشیانی سے ہشیانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔ بے درد کی بھی ادا ہے کہ
اہل دل اس کے میلے میں اس کی تمام پرائیوٹوں پر خاک ڈال دیتے ہیں
اور ان کو اس ہشیانِ عالم پر پیار آنے لگتا ہے۔ مصیبت بے رحموں
کے لئے رحم ہے! اس لئے کہ رقتِ قلب پیدا کرتی ہے۔

دیگر شارمین نے کم و بیش یہ معنی بیان کئے ہیں۔

”لائے کے پھول پر شبنم کے قطرات ایک خاص مطلب ادا کر رہے ہیں
یعنی عرقِ انفعال معلوم ہوتے ہیں کیونکہ لائے کے دل میں داغ تو ہے
لیکن اس میں درد نہیں ہے اور یہ بات اس کے لئے باعثِ شرمندگی ہے۔“
جیسے یہاں لائے کے داغ کو بوجہ اس کے کہ اس میں درد نہیں ہے
اور محض ناشی ہو گئے قابلِ شرم بتایا ہے، اسی طرح غیر سدا دلِ کلام کے ایک
شعر میں پھول کے زخم کی تختیر کی ہے۔

ہم نے سوزِ خمِ جبگر پر بھی زباں پیدا نہ کی
گل ہوا ہے ایک زخمِ سینہ پر خرابانِ داد؟



دل خوں شدہ کُشکُشِ حسرتِ دیدار
آئینہ بدستِ بُتِ بدستِ حنا ہے

اس شعر کی تشریح بعض شارحین نے یوں کی ہے۔

مولانا شوکت:

”دل کُشکُشِ حسرتِ دیدار سے بُتِ بدستِ حنا کے ہاتھ میں آئینہ بنا ہوا ہے۔ یعنی اس کے تقاضا کو کھول رہا ہے کہ وہ تو حنا لگانے کے شوق میں بدست ہے، اور یہاں حسرتِ دیدار میں دل کا کس قدر خون ہو رہا ہے۔ بدستِ حنا بُت کی صفت ہے۔“

حسرت مولائی:

(۱) دل اور آئینہ کی رسائی قسمت کا مقابلہ کرتا ہے کہ ایک ہمارا دل ہے کہ خوں شدہ کُشکُشِ دیدار ہے اور ایک آئینہ ہے جو اُس بدستِ حنا کے ہاتھ میں ہے۔

(۲) دل حسرتِ دیدار میں خون ہو کر بصورتِ حنا اُس کے ہاتھ میں آئینہ بن گیا۔

نظمِ عابدی:

”آئینہ دل صندی بن گیا یعنی حسرتِ دیدار نے اُسے پس ڈالا، اور اس کے جگر کو لہو کر دیا۔ دل کو آئینہ بنا کر پھر اُسے حنا بنا دیا بہت ہی قصع ہے اور بے لطف۔“

افسوں نے اس شکر کے کئی دل آویز معنی بتائے ہیں جن میں کچھ درج کئے جاتے ہیں۔ معشوق اپنے جہاں کی دربا یوں کے نظائے میں ایسا محو و بچودہ مست و مدہوش ہو رہا ہے کہ آئینہ اس کے ہاتھ میں یوں ہے جس طرح حرکت قائم ہے جیسے رنگ حنا کف دست پر اور حسرت و دیار کی کشمکش نے عشاق کے دلوں کو لہو کر رکھا ہے۔

معشوق اپنے مصدی رہے ہوئے ہاتھوں کو اس محویت سے دیکھ رہا ہے جس محویت سے بتان خود پرست آئینہ دیکھتے ہیں اور حسرت و دیار عشاق کا دل لہو کئے دیتا ہے۔

کشمکش حسرت و دیار مشتاقان وید کے دل لہو کئے دیتا ہے اور معشوق کو خود آرائی کا اس قدر شوق ہے کہ آئینہ اس کے ہاتھ میں مصدی بن کر رہ گیا ہے یہی کسی وقت اس کے ہاتھ سے چھوٹتا ہی نہیں۔

حنا اس پرست کے ہاتھ میں آئینہ بنی ہوئی ہے۔ آئینہ کو بے حس و حرکت ہونے کی بنا پر حنا کہنا یا حنا کو معشوق کی محویت کے اعتبار سے آئینہ قرار دینا وہ انداز تکلم ہے جو وہی شاعرِ دل کے سوا کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔ شعر کے الفاظ نہیں شاعر نے سمجھ کر مٹے ڈال دیے ہیں۔ ایک لفظ سے دو سحر لفظ کو دور دیا جا رہا ہے۔ لفظ کشمکش سے دل کے لہو ہونے کی تصویر آنکھوں میں

چہرے لگتی ہے۔ کٹکٹش یہ ہے کہ معشوق کی محویت کا تقاضا ہے کہ اس قتلے سے درگزر روا، اور حسرت دید کہتی ہے کہ بے دیکھے پلٹنا حرام ہے۔ مرزا کا یہ شعر معشوق کی خود پستی اور جہاں کی محویت کے متعلق جواب نہیں رکھتا۔ بعض حضرات کو اس کے سمجھنے بھانسنے میں اس لئے دقت پیش آئی کہ انہوں نے ہر مست حنا کو امانت کے ساتھ ڈھکا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس شعر میں شاہات بھی حسیع ہو گئے ہیں مثلاً دل اور آئینہ کی تشبیہ عام ہے، دل خوں شدہ اور حنا میں تشبیہ موجود ہے ۛ

اگر لکھنوی:

آپنے اس شعر کا مطلب بیان کرنے میں ایک نئی بات پیدا کی ہے۔ "معشوق کے ہاتھوں کا رنگ حنا اُس پر میرے دل کا مال (آئینہ) عیاں کر رہا ہے کہ جس طرح اس کے ہاتھ ہندی لٹنے سے سرخ ہو گئے اُنکی طرح میرا دل کشمکش حسرت دیدار میں خوں ہو رہا ہے تاہم وہ لٹنے بجھدی لگے ہاتھوں کے نغمے میں ایسا محو ہے کہ میرے حال سے بے خبر ہے ۛ

مگر اس موقع پر آئینہ کو عیاں کرنے کے معنی میں سمجھنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ شعر کے معنی یوں بھی صادق ہیں۔ دل اور آئینہ میں جو تعلق ہے وہ ظاہر ہی ہے۔ پھر آئینہ کو کسی دوسرے معنوں میں لے جانا بڑا غلط سمجھا جواہر لے گا۔ اور شعر کی ندرت کو ٹھیس لگے گی۔

ہر فیہ تسلیم چشتی۔

اچھے اس شعر کا مطلب یوں سمجھا ہے۔

”بے بدست کے ہاتھ میں جو آئینہ ہے اُسے آئینہ مست سمجھو، بلکہ

حنا سمجھو یعنی آئینہ نہیں ہے بلکہ حنا ہے، کیونکہ حنا کی طرح اس کا

دل بھی خون (سرخ) ہو گیا ہے اور وہ دل کے خون ہو جانے کی

بے ہے کہ وہ کمال قرب کے باوجود لذت دیدار سے محروم ہے۔“

اس قسم کی تشریح کے ساتھ چشتی صاحب کا یہ بھی ارشاد ہے کہ۔

”یہ شعر بھی غالب کے مغن ترین اشعار میں ہے۔“

جس مودبانہ عرض کروں گا کہ اگر شعر مغن ہے تو اس کی یہ شروع

اس سے کہیں زیادہ مغن ہے۔ یہ کس قسم کی شرح ہے۔ ”اُسے آئینہ

مست سمجھو بلکہ حنا سمجھو یعنی آئینہ نہیں ہے بلکہ حنا ہے۔“ یا ”وہ دل کے

خون ہو جانے کی بے ہے کہ وہ کمال قرب کے باوجود لذت دیدار سے

محروم ہے۔“ آخر کیوں؟ درحقیقت شعر مغن ہرگز نہیں ہے بلکہ تشابہات

جمع ہو جانے کی وجہ سے اس کے کئی معنی پیدا ہو سکتے ہیں جو سب کے سب

زور دار اور پُر لطف ہیں۔ البتہ اس کے وہ معنی جو سلیم صاحب نے بیان

کئے ہیں، دوسرے معانی اور بہتر مطالب کی موجودگی میں ذوق سلیم

پر گراں گزرتے ہیں۔

غیر متداول کلام کا ایک شعر ہے۔

بے خبرست کہہ ہیں بے درد خود بینی سے پوچھ
کلزم ذوقِ نظر میں آئینہ پایاب تھا

عاشق:

میں مرض کرتا ہوں کہ یہ سب مطالبِ شہرِ راجہ دوسرے کہ ہر دہائے تخت
آتے ہیں۔ چو کہ غالب کو کھنجرِ خیل کو مکمل الفاغ میں ادا کرنے کی عادت
ہے اس لئے شاد صبح وہاں بھی اپنی طبع آزمائی سے باد نہیں آتے جہاں
اس کی گنہائش بکلی ہی پیدا کی جا سکتی ہے۔

ہیاں غالب صرف اتنا ہی کہتا ملتا ہے کہ ہمارا دل حسرت دیدار میں
خون ہوا جا رہا ہے، مگر معشوق ابھی تو آرائش ہی ہے۔ ہمیں کامیاب دیدار
نہیں کرتا۔ اسبابِ آرائش میں مصدق بھی ہے اور خون کے رنگ کا اُسے
مناسبت ہے اس لئے اپنے دل کو خون شدہ کہا، تو معشوق کے ہاتھوں کو
مصدق سے رنگین بتایا، جس میں ایک لطیف اشارہ ادھر بھی ہے کہ اس کے
ہاتھ ہمارے خون میں آلودہ ہیں۔ پس اس سے دائرہ کہتا سرورِ دنیا۔

قرشی

قری کف خاکستر و بیل قفس رنگ لے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

مولانا مآلی لکھتے ہیں کہ میں نے خود اس دُشمر کے معنی مرزا سے پوچھے
تھے فرمایا کہ 'اے' کی جگہ 'جز' پڑھو معنی خود سمجھ میں آجائیں گے، یعنی قری
جو ایک کف خاکستر اور بیل جو ایک قفس منصری سے زیادہ نہیں ہے، ان کے
جگر سوختہ یعنی عاشق ہونے کا ثبوت اُن کے چمکنے اور پُرنے سے ہوتا ہے
یہاں جس معنی میں مرزا نے 'اے' کا لفظ استعمال کیا ہے یہ اُنہیں کا اختراع
ہے۔ ایک شخص نے یہ معنی سن کر کہا کہ اگر وہ 'اے' کی جگہ 'جز' لفظ رکھ
دیتے یا دوسرا مصرع یوں کہتے "اے نالہ نشان تیرے سوا عشق میں کیا ہے"
تو مطلب صاف ہو جاتا۔ اس شخص کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے، مگر مرزا چوں کہ
معمولی اسلوبوں سے بچتے تھے اس لئے وہ بہ نسبت اس کے کہ شعر عام نہم
ہو جائے اس بات کو زیادہ پسند کرتے تھے کہ طرز بیان میں حدت اور
زالا پن پایا جائے ۵ (یادگار غالب)

مودبانہ گزارش ہے کہ مولانا مآلی کے بیان کئے ہوئے مطلب سے
شعر کا مضمون بالکل واضح نہیں ہوتا بلکہ اور مغلط اور پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ اغلب
یہی ہے کہ چونکہ مولانا مآلی نے غالب کے بتائے ہوئے معنی فوراً نہیں لکھ
لئے تھے لہذا جب ایک حدت کے بعد وہ ان کو یادگار غالب میں لکھنے بیٹھے
تو اُن کے حافظے نے اُن کی خاطر خواہ مرد نہیں کی۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مولانا مآئی نے یہاں تک تو غالب کا قول لکھا تھا کہ اس کی جگہ جز، پڑھو معنی خود سمجھ میں آجائیں گے؛ اور اس کے بعد 'یعنی قمری' سے جو عبارت شروع کی تھی وہ غالب کی نہ ہو بلکہ محض وہ مضمون ہو جو غالب کے بتائے ہوئے اشارے سے خود مولانا کی سمجھ میں آجاتا۔

غالب کی زندگی میں آخری بار ان کا دیوان مستنداء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں مصرع ادنیٰ میں 'فقس رنگ' کے بجائے 'فقس رنگ' ہے امتیاز علی قرشی صاحب نے نسخہ قرشی میں اس کو سوکا ہے تبصر کیا ہے بخود مولانا نے گفتبینہ تحقیق میں اس امر پر خاص زور دیا ہے کہ شعر کی معنویت کے لحاظ سے صحیح لفظ 'فقس رنگ' ہے نہ کہ 'فقس رنگ'، بخود مولانا صاحب کا ارشاد زیادہ قرین قیاس ہے، اور اس کی تصدیق دیوان غالب کے مستنداء کے اڈیشن سے بھی ہوتی ہے، اور اس سے شعر کا مضمون بھی ادا ہو جاتا ہے۔

قمری اور بلبل کا عاشق ہونا مسلمات شاعری میں سے ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ قمری کے عشق کا ثبوت اس کا خاکستری رنگ ہے۔ بلبل کے عشق کا ثبوت اس کا 'فقس' یعنی مٹیا لارنگ ہے۔ دونوں ہی کے رنگ ایسے ہیں جن سے ان کے چلنے اور چل کر راکھ ہو جانے کی نشان دہی کی جاسکتی ہے اور ہر کیفیت ان کے عشق کا کوئی نہ کوئی ثبوت باقی رہ گیا ہے۔ لیکن لے نالہ میرے ہجر سوختہ یعنی عشق کا میرے پاس کیا ثبوت ہے۔ نالہ کو یوں

مخاطب کیا ہے کہ وہی عشق کا ثبوت ہو سکتا تھا لیکن اس کا کوئی نشان
باقی نہیں رہتا۔

ماحصل یہ کہ قمری اور طبل نے عشق کیا تو ان کے پاس ان کے عشق
کی کوئی نشانی تو ہے اور اس کی بنا پر ان کو بحیثیت عشاق کچھ اعتبار تو
حاصل ہے۔ لیکن میرے عشق کی مجبوری اور نامرادی ملاحظہ ہو کہ میرے
جگر سوختہ کی میرے پاس کوئی نشانی بھی نہیں ہے اور میں اس اعتبار سے
بھی محروم ہوں جو دیگر عشاق کے حصے میں آیا ہے۔ غرض یہ بات واضح ہو جاتی
ہے کہ میرے عشق میں کوئی عنصر نامشی نہیں تھا بلکہ وہ سراسر بے لوث
اور بے غرض تھا۔ یا میرا عشق ایسا کامل تھا کہ میں جلا توڑ لکھ اور خاک
بھی باقی نہ بچی۔

بعض شاعرین نے خصوصاً آخر لکھنوی اور نیا دہلی پوری نے اس پر
بہت سخت اعتراض کیا ہے کہ غالب نے مولا نا حاکمی سے کہا تھا کہ ملے،
کی جگہ، جزا چڑھا جائے تو شعر کا مطلب صاف ہو جاتا ہے۔ آخر لکھنوی
فرماتے ہیں: کوئی لغت اور کوئی محاورہ غالب کا ہم نوا نہیں کہ اسے
کے معنی، جزا ہیں؟ نیا دہلی پوری کا ارشاد ہے: غالب نے بقول خود
اسے، بے معنی، جزا استعمال کیا ہے، حالانکہ اس معنی میں ملے، کا احتمال
کسی نے نہیں کیا اور یہ غالب کا اختراع ہے؟

مجھ میں نہیں بلکہ ان شاعرین نے یہ انوکھی بات ادخود کیسے پیدا کر لی
کہ غالب نے اسے، کے معنی، جزا بتائے تھے۔ غالب کا قول تو صرف

اس قدر خاص اسے کی جگہ، جز، پڑھو، معنی خود بخود صاف ہو جائیں گے۔
 اور یہ بالکل درست ہے۔ جگر سوختہ کا نشان جز نالہ کچھ بھی نہیں ہے، یہ بات
 ذہن میں رکھ لی جائے تو پھر فوراً سمجھ میں آ جاتا ہے کہ چونکہ شاعر دنا کو
 کسی کے سامنے پیش نہیں کر سکتا لہذا وہ اپنی مجھوری اور نامرادی پر
 اور زیادہ زور دینے کے لئے خود دنا سے فریاد کرتا ہے کہ اب تو ہی
 بتا کہ میں اپنے عیش کے ثبوت میں کیا پیش کروں۔ بالکل وہی بات ہے
 جیسے کوئی شخص اس مضموم کو کہہ "جز خدا مجھے کسی کا آسرا نہیں" زیادہ
 پڑا اثر انا میں یوں ادا کرے۔ "اے خدا! میں تیرا ہی آسرا ہے۔"

وقفی رنگ کے بجائے 'وقفی رنگ' کو اگر مصرع ادنیٰ میں مسیح
 سمجھا جائے تو بھی شعر کے بنیادی مضموم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ 'وقفی رنگ'
 سے مراد ہے پھر سے کا ایسا رنگ یعنی مثلاً لایا کالا اور 'وقفی رنگ' سے
 مطلب ہے کئی رنگوں کا مجموعہ یا رنگوں کا محض پھیر یا بتول آخر لکھنوی
 گل سے استعارہ ہے۔ شعر زیر بحث میں بیل 'وقفی رنگ' کے مطلب یہ نکلے گا کہ
 بیل کے گل کے ساتھ عیش کا ثبوت یہ ہے کہ وہ محض چند رنگوں کا پھیر
 رہ گئی ہے (رنگ کی خاصیت اٹھنے کی ہوتی ہے) یعنی اس کی حالت
 خرابی یا وہ گل رنگ ہو گئی ہے اور معشوق کے ہم رنگ ہو جانا اس کے
 عیش کا ایک بہت نمایاں ثبوت ہے۔ لیکن مجھے اس موقع پر 'وقفی رنگ'،
 'وقفی رنگ' سے کہیں زیادہ مناسب اور بے عمل معلوم ہوتا ہے۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد یارِ بگمراں کمرہ گناہوں کی سزا ہے

غالب کے جلدِ شارحین اس شعر کی تعریف اور توصیف میں ہم زبان ہیں۔ حضرت نغم علیا بلخی جنہوں نے اپنی شرح میں غالب پر بہت سی نکتہ چیںیاں کی ہیں اور ان کے کئی اشعار کو بے معنی بتایا ہے، اس شعر کے متعلق فرماتے ہیں: "اس شعر کی داد کون دے سکتا ہے؟ میر تقی کو بھی حسرت ہوئی ہوگی کہ یہ مضمون مرزا نوشہ کے لئے بیکار رہا۔"

مولانا مآلی نے اس کی شرح یوں لکھی ہے: "یہ معنی جو گناہ ہم نے کئے ہیں اگر ان کی سزا ملنی ضرور ہے تو جو گناہ بسبب عدم قدرت ہم نہیں کر سکے اور ان کی حسرت دل میں رہ گئی ان کی داد بھی ملنی چاہئے۔"

تجوز موہانی نے اس شعر کے مطالب یوں بیان کئے ہیں:۔

را کوئی گنہگار دنیا میں اپنے اعمال کا محاسب کرتے وقت یا میدان

حشر میں پریش اعمال کے موقع پر کہتا ہے کہ اسے میرے پروردگار

اگر میرے کئے ہوئے گناہوں کی سزا دیتا ہے تو جن گناہوں کی حسرت

رہ گئی (یعنی جو گناہ قدرت نہ ہونے کی وجہ سے باخیر خوف کے

سبب سے یا تیری خوشنودی کے خیال سے نہیں کئے) پہلے اُسے نکال دے

پھر جو سزا بھی چاہے دے دے میں خوشی سے بھگت لوں گا۔ اس شعر میں

مرزا نے انسان کے ذوقِ گناہ کی انتہا دکھائی ہے۔

(۲) مہر و دگر اگر میرے کئے ہوئے گناہوں کی سزا دینا ہے تو خیر، لیکن جن گناہوں کی حسرت رہ گئی اور تاکامیوں نے میرے دل پر جو قیامتیں توڑ دی ہیں، تو ان سے خوب واقف ہو۔ جو گناہ قدر سے نہ ہونے کی وجہ سے نہیں کئے اُس پر جو تکلیف میرے دل کو ہوئی، عجب نہیں جو میرے گناہوں کا کفارہ ہو گئی ہو، اور جو گناہ تیرے خوف سے نہیں کئے اور جن لذتوں کو تیری خوشنودی کے لئے ترک کیا اُن کا اجر ملنا چاہئے۔ فیصلہ کرنے میں یہ تمام امور مد نظر رہیں، عجب نہیں کہ میں جزا کا مستحق ٹھہروں، سزا کیسی؟ سزا نے باز پُرس قیامت کے لئے قیامت کا جواب پیدا کیا ہے، اور کس لطیف انداز سے اپنا مطلب ادا کیا ہے؟

بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی، غالب زندگی کی پیاس کبھی نہ بجھا سکے
شعر مندرجہ بالا اور اسی قسم کے اشارات کے ارمان انگیز افتاد مزاج کی
بہت خوب عکاسی کرتے ہیں۔

۵ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم بٹکے

بہت بٹکے مرے ارمان لیکن بھر بھی کم بٹکے

۵ اتنا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد!

مجھ سے برے گنہ کا حساب لے خدا نہ مانگ!

شعر زیر بحث میں سب سے زیادہ قابل غور بات یہ ہے کہ غالب کی
زندگی کی سرتوں سے لذت یا ب ہونے کی خواہش اس قدر بے پناہ

ہے کہ وہ اپنے "کردہ گناہوں" کو "ناکردہ گناہوں" کے مقابلے میں
 بیچ اور بے مقدار سمجھتے ہیں۔ وہ خدا کے سامنے اپنا گناہوں سے سیاہ
 اعمال نامہ لے کر کھڑے ہوتے ہیں تو لازم بن کر نہیں بلکہ مستغنیف بن کر
 اور یہ شکایت لے کر کہ بہت سے گناہ جو ان سے کرنے کو رہ گئے آخر
 اُن کے کرنے کی اُن کو قدرت کیوں نہیں بخشی گئی؟ اُن کی رائے میں
 اُن کے کردہ گناہوں کی سزا سے اُن کے ناکردہ گناہوں کی حسرت کی
 جزا کہیں زیادہ ہونا چاہئے۔

شعر کے مصرعہ ثانی میں لفظ "اگر" سے ترشح ہوتا ہے کہ شاعر کا دلی
 خفا تو یہ ہے کہ اس سے اس کے اعمال کی باز پرس بھانڈ کی جائے۔ لیکن
 اگر یہ تقاضائے انصاف ایسا کیا جانا لازمی ہو تو پھر اس بات کو بھی
 ملحوظ رکھا جائے کہ اس نے کردہ گناہوں سے جو لطف و انبساط اُمٹا یا
 اُس سے کہیں زیادہ ناکردہ گناہوں کی محرومی پر سنج و نقب بھی
 برداشت کیا۔ اُسے کردہ گناہوں کی سزا کے ساتھ ناکردہ گناہوں
 کی جزا بھی ملنا چاہئے۔



اس موقع پر ہری چند اختر کا یہ شعر بھی یاد آ جاتا ہے جو بہت خوب
 ہے۔

تو مرے اعمال کا پابند بھلا حشر میں
 ملے خدا میرے خدا تجھ کو خدا بکھا تھا میں!

گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا، مری جوشمار لگا
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاس لگے لئے

مولانا عاتقی کا ارشاد ہے "اُردو میں ایسے بلخ اشعار شاید دو ہمارے
اور نکلیں گے۔ مولانا آکر ترہ جو مرزا کی طرز کو نام رکھتے تھے وہ بھی اس
شعر کے انداز بیان پر مبنی ہوئے تھے۔ روزمرہ کی نغمات الفاظ کی
ہندش اور ایک وسیع خیال دو مصرعوں میں ایسی خوبی سے بیان کرتا
کہ نثر میں بھی اس طرح ادا کرنا مشکل ہے۔ یہ سب باتیں نہایت تعریف
کے قابل ہیں۔"

غائب کا ڈرامائی شور بہت زیادہ بلند اور پختہ تھا انہوں نے
اس شعر کے علاوہ بہت سے اشعار ایسے کہے ہیں جن میں دریا کو کوزے میں
بند کرنے کے مصداق شعر کے انتہائی مختصر الفاظ میں انہوں نے ایک
چوٹا سا ڈراما پیش کر دیا ہے۔ مثلاً:-

سے کون ہوتا ہے حریف مئے مرد انگن عشق
سے ہے مکر رب ساقی پہ صلا میرے بعد!
سے میں نے کہا کہ بزم ناز چاہئے غیر سے تھی!
سے سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں!
سے تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اسے ندیم
میرا سلام کہید، اگر تامل ہے میرے لئے

۵۔ ہلکے تھے ہم بہت سواسی کی سزا ہے ۔

ہو کر اسیر داجے ہیں راہ زن کے پاؤں وغیرہ وغیرہ
شعر زیر بحث حسن بیان کا ایک عجیب و غریب نمونہ ہے۔ اس
میں کتنی معمولی اور پیش پا افتادہ بات کہی ہے، لیکن اس انداز
سے کہی ہے کہ ذوق سلیم و جد کرنے لگتا ہے اور شاعر کی قادر الکلامی
پر ایمان لے آنا پڑتا ہے۔ اشاروں ہی اشاروں سے انتہائی
تفصیل الفاظ میں بڑی چابک دستی سے ایک کافی طویل مضمون کو
پیش کر دیا گیا ہے جیسے کم سے کم لکیروں سے کوئی بہت خوبصورت
تصویر بنا دی جائے جس سے بیک وقت عاشق کی صورت حال
مضمک خیز بھی نظر آتی ہے اور قابلِ رحم بھی۔

عاشق دیدار معشوق کی تمنا میں اُس کے گھر پر پہنچتا ہے تو دروازہ
پر دربان کو مسلط پاتا ہے۔ چنانچہ ایک طرف سرخاموشی سے بیٹھ جاتا
ہے۔ عاشق کا حلیہ ایسا ہے کہ دربان اُس کو کوئی ہلک سا ہنسا
اور اُس کے دردانے کے قریب بیٹھ جانے پر کوئی تفرص نہیں کرتا۔
عاشق اپنی بے تابی شوق سے مجبور رہے، لہذا اُسے بیٹھے بیٹھے کہتا؟
چنانچہ اس امید میں کہ شاید خوشامد کرنے سے دربان اُس کو معشوق
کے گھر میں جانے کی اجازت دے دے گا۔ اٹھ کر اُس کے پیر پکڑ لیتا ہے
اُس کی اس حرکت سے دربان پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ کوئی ہلک سا
نہیں بلکہ عاشق ہے (جن کو بھگانے کے لئے ہی وہ تعینات کیا گیا ہے)

لہذا وہ اس کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتا ہے اور اسے بھگا دیتا ہے۔
 صرف لفظ ”گدا“ سے شاعر کا پریشان حال اور افلاس زدہ
 علیہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، اور اسی طرح لفظ ”شامت“ سے
 یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دربان نے اس کے ساتھ جو برتاؤ کیا وہ
 بڑی سختی اور درشتی کا تھا، قدم پا سبوں کے لئے، کے ٹکڑے سے
 ماشین کے منظر اب شوق کی شدت اور اس کے ماتحت وہ کس حد تک
 اپنے آپ کو ذلیل کر سکتا تھا، ظاہر ہو جاتا ہے۔



نگہ معمار حسرتہا، چہ آبادی چہ ویرانی !!
کہ مزرگانِ حبسِ طرفِ اہو کفِ امانِ صحرا ہے

یہ شعر غالب کے غیر متداول کلام کا ہے۔ تعجب ہو ملے کہ ایسے فکر انگیز اشعار ان کے منتخب دیوان میں جگہ پانے سے کیوں رہ گئے۔ اس کی صرف یہی تاویل سمجھ میں آتی ہے کہ جب غالب اپنے کلام کا انتخاب کرنے بیٹھے تو ان کا مقصد یہ کلام ان کے سامنے نہیں تھا۔ یا پھر یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے زمانے کے ذائقہ شاعری سے محبور ہو گئے تھے جو عموماً صرف حسن و عیش کی چلتی پھرتی چوٹوں اور چٹخولوں ہی کو کمالِ فن سمجھتا تھا۔ اور غالب کو اپنے ہمت کا شہ پارے محض ناقدِ شناسی کے خوف سے قلم زد کر دینا پڑے تھے۔

شاعر کہتا ہے کہ میری نگاہ ہر طرف حسرتیں پیدا کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ خواہ آبادی ہو خواہ ویران میں جس طرف بھی پلک اٹھا کر دیکھتا ہوں مجھے صحرا کا ہی ایک ٹکڑا نظر آتا ہے۔

انسان کی مایوسیاں اور مستیوں، بیشتر داخلی اسباب کا (نہ کہ خارجی اسباب کا) نتیجہ ہوتی ہیں۔ ایک دل شکستہ انسان دنیا کی ہر چیز کو غم انگیز پاتا ہے۔ تصور دنیا کا انہیں تصور اپنی ذہنیت کا ہے جو جو حسرتناک باتوں کا نو ذکر ہی کیا مسرت خیز باتوں میں بھی رنج و الم ہی کا مظاہرہ دیکھتی ہے۔

شاعر نے خوب کہا ہے کہ دیرانی کیا ہے آبادی کو بھی جب میں اپنی
حسرت بھری نگاہ سے دیکھتا ہوں تو جیسے وہ مسمر کا ایک ٹکڑا دکھائی
پڑتی ہے۔

نگاہ کو مسما حسرت ہوا، کہہ کر شاعر نے ایک بہت دہین اور دقیق مضمون
کا بڑی پاکبک دستی سے اعلاہ کر دیا ہے۔

اسی نوعیت کا ایک اور شعر کہا ہے اور بہت خوب کہا ہے۔

بغیر از گاہ حسرت نہ بہار کو تماشا

کہ نگاہ ہے سنہ پوش بجز اسے زندگانی

یہاں بھی نگاہ کو سنہ پوش کہہ کر بہار اور تماشے سے لطیف انداز

نہ ہو سکنے کا سبب اُسی کو قرار دیا ہے۔



دام گاہِ عجز میں سامانِ آسائش کہاں پُرفشانی بھی فریبِ خاطر آسودہ ہے

یہ شعر غیر متداول کلام کا ہے۔ دنیا کے مصائب اور اُس کی لذائذ کا بے حقیقت ہونے کی بڑی لاجواب تصویر کھینچی ہے۔

دنیا کی زندگی کو دام گاہِ عجز یعنی افتادگی اور بے چارگی کی مکین گاہ کہا ہے۔ انسان جس طور سے جبرِ مشیت کا شکار رہتا ہے، اور پنچہ قدرت میں اس کی حیثیت جس طرح ایک عاجز اسیر کی سی ہوتی ہے اس کی بڑی دل نشیں تشیل پیش کی گئی ہے۔

پُرفشانی سے مراد انسان کی وہ کوششیں ہیں جو وہ دولت و شہرت یا آرام و آسائش کے لئے کیا کرتا ہے۔

خاطر آسودہ سے مقصود وہ چھوٹی اور محدود طبیعت ہے جو بہت ہمت یا اصل حقیقت کا بے بہرہ ہونے کے باعث ذرا ذرا اسی باتوں پر خوش ہو جا کرے اور اُنہیں کو غنیمت سمجھ لیا کرے جس میں کوئی خطر و تجسس یا اُتار نہ ہو۔ اس سلسلے میں غالب کے غیر متداول کلام کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔

رشاکِ آسائشیں اربابِ غفلت پر اسد

عجب دتابِ دل نصیبِ خاطرِ آگاہ ہے

شعریہ بحث میں شاعر کہتا ہے کہ یہ دنیا افتادگی اور بے چارگی کا

ایک جاں ہے، اس میں سامان آسائش یا آرام اور سکون کی تلاش بالکل لامعبر ہے۔ جو لوگ جبرِ مشیت کا شکار ہوتے ہوئے بھی یہاں دوست اور شہرت وغیرہ کے حصول کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں اور اسی کو مہتمائے زندگی سمجھتے ہیں وہ صرف خود فریبی میں مبتلا ہیں۔

پیدائش سے موت تک انسان کو تقنا و قدر کا تابع فرمان رہنا پڑتا ہے۔ قانونِ قدر کا سرِ مُو تجاوز کرنے کا اُسے بالکل اختیار نہیں ہے۔ وہ محض ایک بندہ مجبور ہے۔ ایسی صورت میں اُس کی زندگی کے لئے ہمارے نہ صرف بے کار اور بے سود ہے بلکہ خود اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ زندگی خود ہی ایک بے چارگی ہے۔ اس میں بہت کچھ کر سکنے کا امکان ہی نہیں ہے، اور اگر بڑی کاوش اور عرق ریزی کے بعد کچھ کر بھی لیا گیا تو نتیجہ کیا؟ موت سب پر پانی پھیر دیتی ہے۔

شوہنار، نشے، دھبے، ردوبد اور انیسویں صدی کے بہت سے فلاسفروں کا یہی عقیدہ تھا۔

غالب نے اپنے کئی اشعار میں خود زندگی ہی کو موجبِ آلام بتایا ہے۔ ایک شعرِ ملاحظہ ہو۔

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں

مرنے سے پہلے آدمی، غم سے نجات پائے کیوں

موضوع کچھ مختلف ہے لیکن یہ شعر بھی بڑا فکر انگیز ہے جس میں

خود زندگی کو اُس کے بے حقیقت ہونے کے ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے ۔

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردہ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

مطلب یہ کہ میرا وجود کسی چیز کا معلول یا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اپنے
صدمہ پر خود ایک دلیل ہے ۔ میری زندگی سے صدمہ میری شکست کی
 نشان دہی کی جا سکتی ہے ۔

دو شعر اور ملاحظہ ہوں : —

بہ غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
سہ ہری تعمیر میں مضمحل ہے اک صورت خرابی کی
ہیونے برن خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا



طاؤس خاکِ حسنِ نظر باز ہے مجھے ہر ذرہ چمکِ نگہِ تازہ ہے مجھے

یہ بے پناہ شعر غالب کے غیر متداول کلام کا ہے۔ ندرتِ تخیل، حسنِ کلام اور مطبوع بیان کا ایسا دل آویز مرقع باید و شاید دیکھنے میں آتا ہے۔ اور بلاشبہ اس قسم کے اشعار کو دنیا سے شاعری کے نادرات میں کہا جاسکتا ہے۔

خاک کے ذروں پر جب روشنی پڑتی ہے تو وہ مختلف رنگوں کے نظر آتے ہیں۔ اس رمایہ سے شاعر نے خاک کو طاؤس کہا ہے اور بہت خوب کہا ہے۔ زمین پر جو رنگ برنگ پھول، پودے یا دوسری چیزیں دکھائی پڑتی ہیں ان کی رمایہ سے بھی اسے طاؤس خاک کہہ سکتے ہیں۔

حسنِ نظر باز سے مراد ایسا ہلکا مشق جو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کرے۔ چمک کے معنی اشارہ ہیں۔ ذروں پر جب روشنی پڑتی ہے تو ان میں ایک خاص تڑپ پیدا ہوتی ہے، اسے نظر باز کہنا اپنا جواب نہیں رکھتا۔

شاعر کہتا ہے کہ مجھے یہ (طاؤس خاک) خوبصورت، رنگ برنگی زمین ایک ایسا مشق معلوم ہوتی ہے جو نظر باری کر رہا ہو کیونکہ اس کا ہر ذرہ مجھے نگاہِ تازہ کا ایک اشارہ دکھائی پڑتا ہے۔ مطلب یہ کہ اس

دلفریب دنیا کے ذرتے ذرتے میں میرے لئے قدرت کا کوئی نہ کوئی
پیغام مضمحل ہے اور جو میرے زندگی کے ذوق و شوق پر ناز یا نے کا
کام کر رہا ہے ۔

شاعر نے ایک انتہائی لطیف مضمون کو بڑے اچھے اسلوب کا
ادا کیا ہے ۔ طاؤس خاک ، حسن نظر باز ، چٹک بنگ ناز ، بڑے صنی خیز اور
دل میں کھپ جانے والے الفاظ ہیں جن پر ذوق سلیم و حد کر تل ہے ، اور
شاعر کے حسن انتخاب پر سر دمنتا ہے ۔



وصل میں دل انتظار طرہ رکھتا ہے مگر فتنہ تاراج تمنا کے لئے درکار ہے

یہ شعر بھی غیر متداول کلام کا ہے۔ عجیب و غریب شعر کہا ہے۔
شاعر کی نفسیاتی باریک بینی اور روشنگاری کی بے ساختہ داد دینا
پڑتی ہے۔ اس قسم کے اشعار کی بنا پر بالکل صحیح کہا گیا ہے کہ غالب
کم سے کم اردو زبان میں وہ پہلا شاعر ہے جس نے غزل کو مشن و مشق کی
چیز سمجھا اور محض خیالات اور جذبات کا ترجمان بنانے کے علاوہ
فلسفیانہ بحثوں کا بھی آلہ کار بنایا۔

اس شعر کے سیدھے سادے معنی تو یہ ہوئے کہ شاعر کہتا ہے کہ
مجھے وصل بھی نصیب ہوا (جو عام طور سے عشاق کی معراج یا حاصل
زندگی سمجھا جاتا ہے) تب بھی میرے دل کو اطمینان ہونے کے
بجائے ایک عجیب قسم کا انتظار ہے۔ غالباً یہ انتظار کسی ایسی نئی
مصیبت کا ہے جو (ایک دفعہ پھر) میری تباہیوں کو خاک میں ملا دے گا۔
بادی النظر میں اس مطلب کے کوئی خاص نتیجہ اند نہیں ہوتا جب تک کہ
یہ پیش نظر رکھا جائے کہ شاعر ایک ایسے شخص کی واردات قلب بیان
کر رہا ہے جو مصیبتوں کا عادی ہو چکا ہے اور جسے اپنی زندگی کے ہر گوشے
میں ہمت تار کی نظر آتی ہے۔

طمانیت قلب کے لئے صرف حصول مقصد کافی نہیں ہے۔ اطمینان

کی کیفیات انسان کے انداز فکر اور زاد پر نگاہ کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ عاشق کو اس کا مشق مل گیا تو دنیا یہ کہنے لگی کہ اب اس کو جو کچھ وہ چاہتا مل گیا ہے، لہذا اب اس سے بڑھ کر خوش قسمت انسان اور کون ہو سکتا ہے۔ لیکن عاشق خود اپنی یہ کیفیت بیان کرتا ہے کہ مجھے وصل میں بھی چین نہیں مل سکا۔ میرا دل اتنی بڑی نعمت حاصل کر کے بھی اپنی فطرت کے ہاتھوں پہلے ہی کی طرح مضطرب اور پریشان ہے اور کسی ایسی نئی مصیبت کا متنی ہے جو اس کی بھری چٹنی تناؤں کو پھر سے پامال کر ڈالے۔ محاکات اور مصائب اٹھاتے اٹھاتے انسان اذیت پسند ہو جاتا ہے۔ اتفاق روزگار سے اگر اسے کوئی خوشی نصیب بھی ہو جاتی ہے تو وہ اس سے بہرہ مند ہونے کے بجائے اس میں بھی کوئی رنج کا پہلو تلاش کرنے لگتا ہے۔ رنج دالم اس کی زندگی کا ایسا ادھما بھونانا بن جاتے ہیں کہ ان کے بغیر وہ زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔

ایک دوسری جگہ فرمایا ہے۔ ۵

رنج سے طو کر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے غم
مشکلیں اتنی پڑیں کہ آسماں ہو گئیں

خوشی اور ناخوشی کو انداز فکر اور زاد پر نگاہ کا مرہون منت جتانے
ہوئے غیر متبادل کلام کا ایک اور شعر ہے۔ ۵

شورِ خیز نگ بہارِ گلشنِ ہستی نہ پوچھ
ہم خوشی اکثر رہیں ناخوشی کرتے رہے

اس قسم کے اشارے ہتھ پلتا ہے کہ پیچیدہ نفسیاتی مسائل پر غائب کی
 دسزں گنتی بہ گیر تھی۔ اُن کے زمانے میں غزل کا جو مزاج اور خمیر تھا
 وہ ایسے مسائل کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ عام لوگ اُن کو سمجھنے
 کی کوشش کرنے کے بجائے ان کا مذاق اڑاتے اور مجبوراً غالب
 کو بھی اپنے خون جگر سے بنائے ہوئے ان نقوش کو قلم زد کر دینا
 پڑتا تھا۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ غالب اس سلسلے میں بڑے ناشکر گزار تھے
 کہ انہوں نے بڑی سے بڑی قدردانی کے باوجود اپنی ناقدر دانی کا ردنا
 رد کیا ہے، وہ شاید نہیں سمجھتے کہ اُن کی بنیادی شکایت یہ تھی اور بالکل
 بجا تھی کہ لوگ ان کے کلام کو اس سیارے نہ دیکھتے اور نہ پرکھتے،
 جس کا کہ وہ مستحق تھا۔ وہ اپنے آپ پر کہنے پر مجبور تھے۔ ۵
 ہداز تمیش رنگے، گلزار ہمس رنگے !
 خوں ہو قفسِ دل میں، اے ذوقِ پُرافنائی



گدلے طاقت تفریر ہے زباں تجھ سے
کہ خاموشی کو ہے پیرایہ بیاں تجھ سے

غالب کے غیر متداول کلام میں جسے اکثر ان کا قلم زدہ کلام کہا جاتا ہے، یہ ایک غزل مسلسل کا مطلع اول ہے۔ پور کی غزل کا مخاطب خدا سے ہے۔ اس میں حمد اور دعا کے ساتھ ہی شکوے اور طنز کی بڑی فکر انگیز آمیزش ہے۔ ایک حیثیت سے اسے علامہ اقبال کے شکوہ کا پیش رو کہا جاسکتا ہے۔ اس غزل کی تصنیف کے وقت غالب کی عمر مشکل سے چوبیس سال کی تھی۔

شاعر کہتا ہے کہ زبان اپنی طاقت گویائی کی بسبب تجھ سے مانگتی ہے۔ (کیونکہ، خاموشی کو بیان کا پیرایہ تو ہی عطا کرتا ہے یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ تیرے حضور خاموشی بھی بیان کی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی زبان پر حشر مطلب نہ بھی آئے تب بھی تو اس کو بھگھ لیتا ہے۔ تو دل کی بات بھی جانتا ہے۔



فسردگی میں ہے فریاد بے دلاں تجھ سے
چراغ صبح و گلِ موسم خزاں تجھ سے

افسردگی کے عالم میں افسردہ دل تجھی سے فریاد کرتے ہیں کیونکہ
چراغ صبح کی بے نوری اور گلِ خزاں کی پژمردگی کا تو ہی ذمہ دار
ہے۔ شعر میں ایک قسم کا طنز سا محسوس ہوتا ہے۔ شاعر کہنا یہ چاہتا
ہے کہ تو ہی غلٹیوں اور مایوسیوں کو خلق کرتا ہے، لہذا ان کے مقلد
یا حسرت کے عالم میں شکستہ دل لوگ تجھی سے فریاد کرنے پر
مجبور ہیں۔



پری بیشیہ و عکس رُخ اندر آئینہ نگاہ حیرت مشاطہ، خوں نشاں تجھ سے

پری خود شیشے میں پوشیدہ ہے، لیکن اس کے رُخ کا عکس آئینے میں دکھائی دے رہا ہے۔ مطلب یہ کہ معشوق حقیقی (باری تعالیٰ)، خود تو نگاہوں سے اوجھل ہے لیکن اُس کی ذات گرامی کا پرتو ہم کائنات کی ہر چیز میں دیکھ رہے ہیں۔ یہ عجیب و غریب تماشا دیکھ کر اہل دل یا صاحب نظر کی حیرت زدہ آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا ہے۔

بہت خوب اور بڑے انوکھے انداز سے کہا ہے۔

پری، حسین یا معشوق کو کہتے ہیں۔ پری کی رعایت کا شیشہ کہا ہے جس سے حجابِ قدس مُراد ہے۔ عکس رُخ سے ذات گرامی کا پرتو یا اُس کی قدرت کی کار فرمایاں مقصود ہیں۔ آئینہ کائنات کو کہا ہے اور لا جواب کہا ہے۔ ساری کائنات معشوق حقیقی کی حبِ لوہ سا مانگوں سے سرشار ہے اور انسان اس آئینے میں اُس کو نہیں صرف اُس کا عکس رُخ دیکھتا ہے۔ یہ کام صرف آئینہ ہی کر سکتا ہے کہ کوئی اس میں اپنی صورت دیکھے اور ہم اس کوئی، کو براہِ راست دیکھے۔ بغیر صرف اس کا عکس آئینہ میں دیکھیں۔

پری، شیشہ، عکس رُخ، اور آئینہ کے خیال سے مشاطہ کہا ہے

جس کا کام آرائش کرنا اور سنوارنا ہوتا ہے۔ یہاں اس سے اہل دل یا صاحب نظر مراد ہے۔ جو ذات گرامی کے حسن کا پرتو، تو ایک ایک شے میں دیکھتا ہے لیکن خود اس سے کہیں بھی نہیں دیکھ پاتا۔ اور یہ بات انتہائی حیرت کا موجب ہے۔

ماشبہ :
 ”دوسرے مصرعہ کا مطلب یہ ہونا چاہئے کہ مشاطہ جو طرزِ طرح کی آرائش سے مشغول کا حسن بڑھاتی ہے اس کے حسن کو دیکھ کر حیرت میں غرق ہے۔
 یعنی وہ حسن اور طواریا ہے کہ مشاطہ اُس کو دیکھ کر محو حیرت ہو گیا۔“
 قرشی

بہار حیرت نظارہ سخت جانی ہے حنائے پائے اجل خون کشتگاں تجھے

بہار حیرت نظارہ (نظارہ کی حیرت کی بہار) سے مراد حیرت انگیز منظر کا نقطہ عروج یا ایک انتہائی دل چسپ تماشا ہے۔ سخت جانی سے مقصود عالم نزع کی تخلیق انسان کا سرمر کر جینا، مصائب اور پریشانیوں کے درمیان زندگی کے لئے جہود و جد کرنا ہے۔

انسان کن تکلیفوں اور مصیبتوں کے درمیان زبرہ رہنے کی کوشش کرتا ہے، یہ ایک انتہائی حیرت انگیز اور دل چسپ تماشا، حالانکہ مرنا ایک امر لازمی ہے اور مرنے والوں کا خون اجل کے پاؤں کی حنا کا کام کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ تو پہلے ہمارے معذور کر چکا ہے کہ انسان اپنی جان سے جانے اور اس سے موت کے حسن (یا دہش) میں اضافہ ہوتا رہے۔

ماشیہ۔ مسیحی دانت میں اس شعر میں زندگی اور موت کی کشمکش کا بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی کی وہ کشمکش جو سوکھے مقابلہ کرنے میں پیش آ رہی ہے دو قابل داد ہے کہ وہ کسی طرح سوکھے چٹکن میں آنے کو تیار نہ ہیں اور باوجودیکہ تیرے حکم یا تیروے جلتے ہوئے آئین کے مطابق زندگی کا خون پائے اجل کی حنا بنتی رہتی ہے لیکن زندگی دوسری نئی نئی شکلیں اختیار کر کے نمودار ہوتی رہتی ہے۔

طراوتِ سحر ایجابی اثر یکٹ سو بہارِ نالہ و رنگینی فغاں تجھ سے

نلے اور فغاں میں تو اثر کا جادو پیدا کر کے اُسے جس قدر موجب تسکین بنانا ہے وہ تو ایک طعنہ ضرور ہوا۔ نلے کی بہار اور فغاں کی رنگینی جیسی نعمتیں بھی تو تیری دینا ہیں۔

اپنی نوعیت کا لاجواب شعر کہا ہے۔ مطلب یہ کہ نلے اور فغاں میں تو جہاں شریک کرتا ہے یا انہیں شرف قبولیت بخش کر میں طور سے عادی خواہ کی دل دہی کر دیتا ہے وہ تو ایک علیحدہ بات ہے۔ اُس سے قطع نظر اُن سے جو لطف اور انبساط حاصل ہوتا ہے وہ جی تیری ایک خاص عطا اور بخشش ہے۔

ما مشیہ ۱۔

”مطلب یہ ہے کہ تارِ نیم شبی یا دماغی سحری میں اثر پیدا ہو یا نہ ہو ہم تو اُسی کے شکر گزار ہیں کہ تو نے ہمارے لئے (یعنی اہل دل کے لئے) نلے کو پُر لطف بنادیا ہے کہ ہیں اُسی میں وہ لطف آتا ہے کہ میں کر نہیں سکتے۔“

مرشی

چمن چمن گل آئینہ درکنار ہوس امید محو تماشائے گلستاں تجھ سے

بڑے طنز سے شاعر کہتا ہے کہ تو نے ہوس (اہل ہوس) کے
آغوش میں تو چمن درچمن بھر دیے ہیں، لیکن جو لوگ غیر آسرا لگائے
بیٹھے ہیں، ابھی تک سرت گلستاں کے تماشے ہی میں محو ہیں، ان کے
صے میں سوال ہے اس کے گم نہیں آیا ہے کہ وہ گلستاں کو مہر کا
دیکھتے رہیں۔

بنی اختیار کی اب چاہنے والی دنیا
رہ گئی اپنے لئے ایک خیالی دنیا (اقبال)



نیاز پردہ اظہار خود پرستی ہے جبین سجدہ نشاں تجھ سے آستان تیرے

نیاز یعنی عبادت صرف اظہار خود پرستی کا ایک ہیانہ ہے تیرا، جو عبادت کا طلبگار ہے؟ یا سیرا، جو عبادت کرتا ہے؟ جب سجدہ کرنے والی جبیں بھی تیری اور آستان بھی تیرا تو کون کس کی عبادت کرے؟ اور کیوں؟۔
ہلے شہود و شاہد و مشہود ایک ہے

حیرا ہوں پھر مشاہدے کس حساب میں (غالب)

عبدالباری آسمانی صاحب نے اس شعر کا مطلب یوں لکھا ہے: ”ہلے یہ ہے کہ تیرے سوا کوئی سوجود نہیں، جو کچھ کہے تو ہے جو کچھ کہے تجھ سے ہے۔ ہم نے جس کا نام نیاز رکھا ہے وہ دراصل ایک پردہ ہے جس کی آڑ میں خود پرستی کی جاتی ہے، یعنی کہتے ہیں کہ ہمارا نیاز، ہم نے نیاز کیا، تو یہی ہم کے لفظ کی شرکت ایک قسم کی خود پرستی ہے، در نہ حقیقت یہ ہے کہ سب باتیں ہیں نہ کوئی چیز مجھ سے نہ نیاز ہے۔ جبیں تیری، سجدہ نشانی تیری، آستان تیرا۔ ہلے کیا خوب کہا ہے۔“

”خدا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو حسم ہوتا

ڈھویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا“

حاشیہ: ”یہ شعر مدۃ الوجود کے مسئلے سے متعلق ہے یعنی جب مابعد وجود سب ایک ہی تو ہر نیاز یا عبادت خود پرستی نہیں تو اور کیا ہے؟“

مرحلی

بہادِ جوئی رحمت، کمیں گریِ تقریب وقائے حوصلہ و رنجِ امتحانِ تجھ سے

تیری رحمت اپنی کار فرمائی کے لئے موقع اور محل کے پہلے تلاش کرتی رہتی ہے۔ ایک طرف تو ہی الساکچہ اپنی من مانی کر گزرنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے اور دوسری طرف تو ہی ان کے اعمال کا محاسبہ بھی کرتا ہے اور انہیں طرح طرح کی آزمائشوں میں بھی ڈالتا ہے۔
مطلب یہ کہ تو ہی اپنے بندوں کو گناہ کرنے کا حوصلہ دیتا ہے پھر تو ہی ان گناہوں کا استباب بھی کرتا ہے اور اس طرح تجھے اپنی رحمت کی فیاضیاں دکھانے کا موقع مل جاتا ہے۔

ما شبہ ۱۔

”تو ہی اپنے بندوں کو اپنی ذات والا صفات کا محبت کرنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے اور تو ہی دوسری طرف ان کا امتحان بھی لیتا ہے۔ اگر تو اپنی رحمت کا ان کو یہ حوصلہ عطا نہ کرتا تو پھر ناممکن تھا کہ وہ تیرے ہر امتحان میں پورے اُتر سکتے“

عرشی

اسد بہ موسم گل در طلبم کنجِ قفس
خرام تجھ سے، صبا تجھ سے، گلستاں تجھ سے

بہار کا موسم ہے اور اسد قفس کے گوشے میں قید پڑا ہے۔ کبھی نے
عاقبتِ خرام عطا کی، کبھی نے صبا بنائی، کبھی نے گلستاں بنایا۔ ایک
اسیرِ غم کے لئے ان کا کیا مصروف ہے؟ تو اُسے بھی ان نعمتوں سے
نطف اندوز ہونے کی توفیق عطا کر دے تو تیرے لئے کون سی بڑی
بات ہے۔ شاعر کی انتہا بڑی دردناک اور موثر ہے۔



زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غائب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

مندرجہ عنوان شعر متداول دیوان میں تہا مدح ہے ۔ جیسا کہ
اختیار علی قرطبی صاحب نے تحریر فرمایا ہے ، ابھی حال میں وحید الدین نظامی
بداؤنی صاحب کے مکتوبہ مخطوطے میں اس کے ساتھ کے دو اشعار اور بھی
دستیاب ہوئے ہیں جن سے اس کا لطف دو بالا ہو جاتا ہے ۔

اور تو رکھنے کو ہم دھرم میں کیا رکھتے تھے
مگر اک شعر میں اندازہ رسا رکھتے تھے
اُس کا یہ حال کہ کوئی نہ ادا سنج بلا ۴
آپ لکھتے تھے ہم اور آپ اُٹھا رکھتے تھے
زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غائب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

غالب

کا

غیر متداول کلام

(مختصر انتخاب)

دشنہ رخنہ بانستاں نادرے پناہ
 تیرا ہی عکس رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں
 قید حیات و بند غم اسل میں دونوں ایک ہیں
 موصے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
 حسن اور اس پر حسن ظن رہ گئی بوالہوس کی مشرم
 اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں
 وہاں وہ ضرور حزن دنا زیاں یہ حجاب پاس وضع
 راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں
 ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
 جس کو ہو دین و دل حزن یزاس کی گلی میں جا کیوں
 غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
 دودھے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

غنچہ نا غلغلتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
 بوسہ کو پوچھتا ہوں میں تھکے سے مجھے بتا کہ یوں
 پریش طرز و لہری کیجئے کیا کہ جن کہے
 اُس کے ہر اک اشارے سے بھلے ہے یہ ادا کہ یوں
 رات کے وقت مئے پئے ساتھ رقیب کو لئے
 آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہتا تو دیکھئے
 سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنے کیوں
 میں نے کہا کہ بزم ناز چاہئے غصے سے تھی
 سن کے ستم ظریفی کا مجھ کو اُٹھا دیا کیوں
 جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ جو رشک تار سی
 گفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کیوں

(۹)

صد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو
 کہ چشم تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے دا ہو
 طاعت میں تار ہے نہ مئے دانگیں کی لاگ
 دوزخ میں ڈال دو کوئی بے کربشت کو
 غالب کچھ اپنی سعی سے کہنا نہیں مجھے
 نہ خرمن جلے اگر نہ تلخ کھائے کشت کو
 دارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
 کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو
 ہے مجھ کو بخند سے تذکرہ خیر کا گلہ :
 ہر چند ہر سبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو
 پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا
 یوں ہو تو چارہ غیم الفت ہی کیوں نہ ہو

ڈالانہ ہے کسی نے کسی سے معاملہ
 اپنے سے کھینچا ہوں خیالت ہی کیوں نہ ہو
 ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
 ہم الجھن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
 ہنگامے زبونی ہمت ہے افعال
 حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو
 مٹتا ہے خوف فرست ہستی کا غم کوئی
 عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو
 اُس فتنہ خو کے در سے اب اُٹھتے نہیں اسد
 اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

قفس میں ہوں گرا چھا بھی نہ جانیں میر شیون کو
 مرا ہونا بُرا کیا ہے تو اسخیاں گلشن کو
 نہیں گرہی آساں نہ ہو بر شک کیا کم ہے
 نہ دی ہوتی خدا یا آرزوئے دوست دشمن کو
 نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اُس جراحت پر
 کیا سینہ میں جس نے خونچکاں مژگان سوز کو
 خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
 کبھی میرے گریباں کو کبھی جانان کے دامن کو

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آئے
 سمجھتا ہوں کہ ٹھونڈے چوبھی سے برق خرمین کو
 وقاداری بشرط استواری اصل ایسا ہے
 نرے بک خانے میں تو کعبے میں گاڑ د برہمن کو
 نہ لگتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
 رہا کھٹکا نہ چوڑی کا دعا دیتا ہوں رہزن کو
 سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جو یا ہوں جواہر کے
 مگر کیا ہم نہیں رکھے کہ کھودیں جلے معدن کو
 بجائے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ
 ہو کر اسیر دانتے ہیں راہزن کے پاؤ
 مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور گور
 تن سے سوانگا رہیں اُس خستہ تن کے پاؤ

جان کر کیجئے تفاضل کہ کچھ امید بھی ہو
 یہ نگاہ غلط انداز تو سم ہے ہم کو
 سر اٹوانے کے جو وعدے کو مکر حیا ہا
 ہنس کے بوئے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو
 تم وہ نادرک کہ خوشی کو فناں کہتے ہو
 ہم وہ عاجز کہ تفاضل بھی قسم ہے ہم کو

تم جانو تم کو ضحیکہ جو رسم و راہ ہو
 مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو
 اکبر! ہوا نقاب میں ہے اُن کے ایک تار
 مڑتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
 جب سیکدہ چٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
 مسجد ہو مدرستہ ہو کوئی خانقاہ ہو
 کھنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
 لیکن خدا کرے وہ تری حب لوہ گاہ ہو
 ہائے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
 کہ گرنے ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو
 اُچھٹے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
 جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو
 جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
 وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو
 مجھے جنوں نہیں غالب دے بقول حضور
 فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو

کسی کو دے کے دل کوئی تو اپنے فنا کیوں ہو
 نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر مُنہ میں زباں کیوں ہو

وہ اپنا خون چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
 شکر سرین کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
 کیا غم خوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
 نہ لےے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو
 وفا کیسی کہاں کا عیش جب پھوڑنا ٹھہرا
 تو پھر لے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستان کیوں ہو
 قفس میں مجھ سے رواداد چمن کہتے نہ ڈر ہوم
 گری ہے جس کی کل بجلی وہ میرا آستان کیوں ہو
 غلط ہے جذب دل کا شکوہ دیکھو جو کس کا ہے
 نہ کھینچو گرم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو
 یہ فتنہ آدمی کی حسد ویرانی کو کیا کم ہے
 ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُمس کا آستان کیوں ہو
 کہا تم نے کہ کیوں ہو غصے کے رٹنے میں رسوائی
 بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو
 نکالا جا ہتا ہے کام کیا غصوں سے تو غالب
 ترے بے ہر کہنے سے وہ تجھ پر ہر باں کیوں ہو

رہے اب ایسی جگہ مل کر جہاں کوئی نہ ہو
 ہم سن کوئی نہ اور ہم نہ باں کوئی نہ ہو

ہے درد دیوار سا ایک گھر بنایا جا ہے
 کوئی ہمایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
 پڑیے گر بیسار تو کوئی نہ ہو تیسار دار
 اور اگر مر جائے تو فوج سرخاں کوئی نہ ہو

(۵)

ہے سبزہ زار ہر درد دیوار غنیمت کدہ
 جس کی ہمار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ
 ناچار ہے کسی کی بھی حشر اٹھائے
 دشواری رہ دستم ہم رباں نہ پوچھ

(۶)

مدد جہلہ رو بردے جو شرکاں اٹھائے
 طاقت کہاں جو دید کا احساں اٹھائے
 دیوار بار منت مزدور سے ہے حشم
 ملے خانان حشر اب نہ احساں اٹھائے
 یا میرے زحشم رشک کو رسوا نہ کیجئے
 یا پردہ تبسم ہنساں اٹھائے

جے دادا سے فلک دلِ حسرت پرست کی
 ہاں کچھ نہ کچھ تلاقی مافات ہاں ہے

یکے ہیں مسرِ رخوں کے لئے ہم مصوری
 تقریب کچھ تو ہمسر ملاقات چاہئے
 مے سے خرم نشا ط ہے کس رو سیاہ کو
 یک گو نہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے
 ہے رنگ لالہ دگل نسریں جُدا جُدا
 ہر رنگ میں ہمار کا اثبات چاہئے
 سراپے حشم پہ چاہئے ہنگام بخودی
 رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہئے
 یعنی ہر حسب گردش پیمانہ صفا
 عارف ہمیشہ مستائے ذات چاہئے

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
 سورہت ہے بانڈازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی
 ہے اس شوخ سے آزرده ہم چندے تکلف
 تکلف بر طشہ تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی
 خیالِ مرگ کب تسکینِ دل آزرده کو پہنچے
 مرے دامِ تنہا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی
 داتا برکششِ تنہی جفا پر نازِ سرِ مازِ ۷۷
 مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

مے عشرت کی خواہش ساقی گردوں کیا کیجے
 لئے بیٹھا ہے اک دو پار جامِ داغگوں ہ بھی
 مرے دل میں ہے غائب شوق وصل شکوہ ہجراں
 خدادادہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں ہ بھی
 ہے بزمِ بستاں میں سخن آزر دہ لبوں سے
 تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے
 ہے دورِ قدحِ حبس پریشانی صہبَا
 یک بار نگا دو چشم سے میرے لبوں سے
 زندانِ دیر سے کہہ گستاخ ہیں ز ا چہ
 ز نہار نہ ہونا طعنے ان بے ادبوں سے
 تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
 سُن لینے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے
 گھر میں تھا کیا کہ ترا عنہم اُسے غارت کرتا
 وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ نمبر سو ہے

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
 فلک کا دیکھنا تقریبِ تیرے یاد آنے کی
 بیٹنا پر نیاں میں شعلہ آتش کا آساں ہے
 دے مشکل ہے حکمتِ دل میں سوزِ غم چھپانے کی

اُنہیں منظور اپنے زنجیوں کا دیکھ آنا تھا
 اُٹھے تھے سیر گل کو دیکھنا شوخی ہانے کی
 بہاری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا
 ترا آنا نہ تھا غلام مگر تہید جانے کی
 لکھ کو پُچھا حادث کا تھل کر نہیں سکتی
 مری طاقت کہ ضامن تھی توں کے ناز اُٹھانے کی
 کہوں کیا خوبی اد ضائع ابناے زماں غالب
 جہاں کی اُس نے جس سے بہنے کی تھی بارہا نیکی
 حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی
 دل جوش گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی
 اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
 میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتامی

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
 جس میں کہ ایک جینے مورا آسان ہے
 ہے کائنات کو حرکت نہیکر ذوق سے
 پر تو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے
 ہے بارے اعتماد و مساداری اس قدر
 غالب ہم اس میں خوش ہیں کہ ناہر بان ہے

در دے میرے ہے تجھ کو ہے قرار ی ہائے ہائے
 کیا ہوئی ظالم تری خصلت شکاری ہائے ہائے
 تیرے دل میں گرنے تھا آشوب غم کا حوصلہ
 تو نے پیر کیوں کی تھی میری عکساری ہائے ہائے
 کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا شاخیاں
 دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے
 عمر میر کا تو نے بیان دنا باندھا تو کیا
 عمر کو بھی تو نہیں ہے پاداری ہائے ہائے
 زہر گنتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
 یعنی تجھ سے تھی اُسے ناسازگاری ہائے ہائے
 گفتاں ہائے تازہ حبلوہ کو کیا ہو گیا
 خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے
 شرم رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں
 ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے
 خاک میں ناموس بیان محبت بل گنتی ۛ
 اُنکھ گنتی دنیا سے راہ و رسم یاری ہائے ہائے
 ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا ۛ
 دل پہ اک گلے نہ پایا دھم کاری ہائے ہائے
 گوش مجبور پیام و چشم محسوس جمال
 ایک دل قس ہے یہ نا اُمید داری ہائے ہائے

عشق نے کپڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ
 رہ گیا تعادل میں جو کچھ ذوق خواریا ہائے ہائے
 ہے وہ غرور حسن سے بیگانہ اور بے
 ہر چند اس کے پاس دل حق شناس ہے
 ہر اک مکان کو ہے مکین سے شرف اسد
 مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے
 گرفتاری سے فائدہ اخلائے حال ہے
 خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے
 ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی
 لے شوقِ منفصل یہ تجھے کیا خیال ہے
 ہستی کے مست فریب میں آ جاؤ اسد
 عالم تمام طاعتِ دامِ خیال ہے
 جی ملے ذوقِ فنا کی ناکامی پر نہ کیوں
 ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتشبار ہے
 ہے وہی پرستی ہر ذرہ کا خود عذر خواہ
 جس کے جلوے سے زمین تا آسمان سرشار ہے
 مجھ سے مست کہ تو ہیں کہتا تھا اپنی زندگی
 زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

خزاں کیا فصلِ گل کتنے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں نفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے
نہ لائی شوخی اندیشہ تاب رنج نومیدی
کفِ افسوس منامد تجدیدِ تمنا ہے

عیش مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی	میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجئے نہ قسطن ہم سے	کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی	لے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے	غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو	آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
عمر ہر چند کہ ہے برقِ حشرام	دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
ہم کوئی شرک و ناکرتے ہیں	نہ سہی عشقِ مصیبت ہی سہی
کچھ تو ہے اسے فلک نا انصاف	آہ و فزاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے	بے نیازی تری عادت ہی سہی
یار سے چھوڑ چلی جائے اسد	گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

دُسوڑے ہے اُس نستی آتشِ نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فضا ہے
ستانِ طے کردوں ہوں رو دادِ خیال
تا باز گشتِ نہ رہے مڑ عسا ہے

کھٹا کسی پہ کیوں مرے دل کا مہلا
 شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے
 زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غائب
 ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
 اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حسیا کئے
 بیٹھا رہا اگر چہ اشارے ہوا کئے
 رکھتا پیروں ہوں خرقۂ وسجادہ رہنے سے
 مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کئے
 بے مروت ہی گزرتی ہے ہو گر چہ عسکرِ خضر
 حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کئے
 معذور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ ملے نعیم
 تو نے وہ گنج ہائے گرامتسا بہ کیا کئے
 ضد کی ہے اور بات مگر خو بُری نہیں ؟
 بموے سے اُس نے سیکڑوں وعدے دفا کئے
 غائب تھیں کوو کہ ملے گا جواب کبیا
 مانا کہ تم کہتا کئے اور وہ سنا کئے

نظارہ کیا حریت ہو اُس برقی حسن کا
 جو جہاں جہاں جلوے کو جس کی نقاب ہے

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں ؟
 مانا کر تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے
 دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
 میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
 ہاتھ دھو دل سے بھی گرمی گرا نہ بیٹھے میں ہے
 آگینہ تندی صہبا سے پگھلا جائے ہے
 گرچہ ہے طرزِ تناسل پر وہ دارِ رازِ عشق
 ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے
 نقش کو اُس کے مصوّر پہ بھی کیا کیا ناز ہیں
 کھینچتا ہے جس قدر اُٹتا ہی کھینچتا جائے ہے
 کثرتِ آرائی و عدت ہے پرستاری و ہم
 کر دیا کافرانِ اصنام خیالی نے مجھے
 ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
 محبِ آرام دیا ہے پردہ بالی نے مجھے
 آگ رہا ہے درو دیوارِ پستِ غائب
 ہم بیاہاں میں ہیں اور گھر میں بہا آئی ہے

سادگی پر اُس کے مرنے کی حسرت دل میں ہے
 بس نہیں چلتا کہ پھر خنجرِ کعبِ قاتل میں ہے

دیکھنا تفریق کی لذت کہ جو اُس نے کہتا
 میں نے یہ جاننا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
 گر یہ ہے کس کس بُرائی سے دے بائیں ہمہ
 ذکرِ میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے
 بس ہجومِ نا اُمیدی خاک میں مل جائے گی
 یہ چراگِ لذت ہماری سعی ہے حاصل میں ہے
 رنجِ رہ کیوں کھینچے داما ندگی کو عشق ہے
 اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے
 جلوہ زارِ آتشیں دوزخ ہمارا دل سہی
 فتنہ شورِ قیامت کس کے آبِ دہل میں ہے
 ہے دلِ شوریدہ غالبِ ظلمتِ رنجِ دتاب
 رحمِ کراچی تنہا پر کہ کس مشکل میں ہے

وہ بادۂ شبانہ کی سرسٹیاں کہاں
 اُنٹھے میں اب کہ لذتِ خواب سحر گئی
 دیکھو تو دلفریبیِ اعزازِ نقشبِ پا
 موجِ خزاں یار بھی کیا گلُ کُتر گئی
 ہر پوا ہوس نے حسنِ چستی شعار کی
 اب آہوئے شیوہ اہلِ نظر گئی
 نفاے نے بھی کام کیا وہاں نقاب کا
 مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر کبھر گئی
 مارا زلمے نے اسدا شرفِ خاں تمہیں
 وہ دلوے کہاں وہ جوانی کہ مر گئی

ختم شد

دلت خیال نازک دانتھار ہے مسترار
 یارب، بیانِ شائے کشش گفتگو نہ ہو
 واں پر نشانِ دامِ نظر ہوں جہاں اسد
 صبح بہار بھی، قصے رنگ و بو نہ ہو
 نہیں جز درد، تشکین کو ہیش ہائے بے درداں
 کہ سوچ گریہ میں صد خندہ دندانِ ناگم ہو
 بلا گردانِ مکین بناں صد موجبِ گوہر
 عرن بھی جن کے عارض پر تکلیفِ مبالغہ ہو
 اُستادے کب وہ جانِ شرمِ تہمت قتلِ عاشق کی
 کہ جس کے ہاتھ میں مانندِ خوں رنگِ حنا گم ہو

(۵)

ہر داغ تازہ یک دل داغِ انتظار ہے
 عرضِ فضا کے سینہ در دامتخاں نہ پوچھ
 کہنا خاکل وہ نامہ رساں سے برسوزرِ دل
 دردِ جدائیِ اسد اللہ خاں نہ پوچھ
 کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگڑ سے
 ہے ہر اک فردِ جہاں میں ورن ناخواندہ
 بکھرے پتے ہیں اربابِ فنا پوشیدہ
 خطِ پیمانہ سے ہے نفسِ دردیدہ

شکوہ و شکر کو شریں ہم دامنِ سب کا سمجھ
خانہ آگ کی خراب ، دل نہ سمجھ بلا سمجھ
گاہ بہ خلد اسید دار ، گر بہ جھیم جیم ناک
گرچہ خدا کی یاد ہے ، کلفت ماہوا سمجھ
اے بہ سراپِ حسنِ خلق ، تشنہ سعی امتحان
شوق کو منفعل نہ کر ، ناز کو انتخاب سمجھ
شوخیِ حسن و عیش ہے آئینہ دار ہم دگر
خار کو بے نیام جان ، ہم کو برہنہ پا سمجھ
نے سرد برگ آردوئے رہ در سیمِ مشکو
لے دل و جانِ خلق تو ، ہم کو بھی آشنا سمجھ

(۱)

ہستی فریب نامسکرموج سراپ ہے
یک عصر ناز شوخیِ عنوان اُٹھائے
مجھے معلوم ہے جو تو نے میرے حق میں شوچا ہے
کہیں ہو جائے جلد لے گردش گردنِ دونِ وہمی
کرتے ہو شکوہ کس کا؟ تم اور بے وفائی؟
سر پیٹتے ہیں اپنا ، ہم اور نیک نامی؟
صدرنگ گل کترنا ، در پردہ قتل کمرنا
تجہ ادا نہیں ہے پا بسندو ہے نیا می

ہر چند عشر گزری آ زردگی میں، مینک
 ہے شرح شوق کو بھی جوں شکوہ ناتمامی
 ہے یاس میں آس کو سانی سے بھی فراغت
 دریا سے خشک گزری مستوں کی تشنہ کلامی
 نظر، نقص گمبایاں، کمال ہے ادبی ہے
 کہ غار خشک کو بھی دعوتِ جہنم نسبی ہے
 ہوا دھانی سے شوقِ دلِ حریص زیادہ
 لبِ قدح پہ کعبہ بادہ، جو شِ تشنہ لبی ہے
 جہنم میں کس کی یہ برہم ہوئی ہے بزمِ تاشا؟
 کہ برگِ برگِ سخن شیشہ رنجِ طبعی ہے
 بے چشمِ دل نہ کر ہو بس سیرِ لالہ زار
 یعنی یہ ہر ورق، ورقِ انتخاب ہے
 تا چند بہت، نظر ترقی طبع آرزو؟
 یارب ملے بلندی دست دعا بے
 یک بار امتحان ہو بس بھی ضرور ہے
 اسے جو شِ عشقِ بادِ کُرد آ دماغے

کہوں کیا گرم جوشی سے کشی میں شعلہ رویاں کی
 کہ تہِ خانہ دل آتش سے سے فروزاں کی

بیادِ گرمیِ محبتِ بزرگِ شعلہ دہکے ہے
 چھاؤں کیونکر غائبِ سودشیں داغِ غایاں کی
 خردِ لطفِ سانیِ شہر ہے باکیِ ستاں
 غمِ داناںِ عصیان ہے طراوتِ موجِ کوثر کی
 ہوا ہے مانعِ عاشقِ نوازیِ تازِ خود بینی
 تکلفِ بر طائرِ آئینہ تمیزِ مائل ہے
 ہوں گرفتارِ کمیں گاہِ تناسل کہ جاں
 خوابِ سیاد سے پردا زِ گرائی مانگے
 با صفا دانا ندگی ہے عمرِ فرصتِ جو بجے
 کر دیا ہے پایہ زنجیرِ رم آہو بجے
 سرورِ شہرِ گردش، اگر کیفیتِ افزا ہو
 نہاں ہر گردِ بادِ دشت میں جامِ سفالی ہے
 عروجِ شہر ہے سرتاقِ قدمِ قدیمِ رویاں
 بجائے خود و گردِ سرور بھی مینائے خالی ہے
 ہوا آئینہ جامِ بادہِ عکسِ روئے گلگون سے
 نشانِ خالیِ رخِ داغِ شرابِ پُرنگالی ہے
 سہستی ہے اہلِ خاک کو ابرِ ہسارِ مایے
 زمیں جو شطِ بستر سے، جامِ لبریزِ سفالی ہے
 اسدمت رکھ تعجبِ خردِ ماغیہائے نسیم کا
 کہ یہ نامرد بھی شیرِ افکن میدانِ قالی ہے

داغ ہم دیکر ہیں اہل باغ گر گل ہو شہید
 لالہ چشمِ حسرت آلود چراغِ کشتہ ہے
 ہو جہاں تیرا داغ نازست بے خودی
 خواب نازِ گلِ رُخاں، دو چراغِ کشتہ ہے
 وہ دیکھ کے حسن اپنا مغرور ہوا غالب
 صد جلزہ آئینہ یک صبحِ بدائی ہے
 حسرت کا دیکھ ہے ہیں ہم آب و رنگ گل
 مانند شبنم، اشک ہیں مرگاہِ خار کے
 ہم شوقِ فکر و صل و غم بھر سے اسد
 لائق نہیں رہے ہیں غمِ روزگار کے
 اسد بنہِ قباے یار ہے فردوس کا خنجر
 اگر دا ہو، تو دکھلا دوں کہ یک عالمِ گلستاں ہے
 کجائے ؟ کو عرق ؟ سہی ہر درج نشہ رنگیں تر
 خطِ رخسارِ ماتی تا خطِ ساغرِ چراغاں ہے
 شکست سازِ رسوائی ہے غافل، شرمِ رعنائی
 دلِ خوں گشتہ در دستِ حنا آلودہ عریاں ہے
 اسد جمعیتِ دل در کنار ہے خودی خوشتر
 دو عالم آگہی سا ان یک خواب پریشاں ہے

پیدا کریں دماغِ تماشائی سُرود دگلی
 حسرت کشوں کو ساغرِ دینا نہ چاہئے
 ساتی، بہارِ موسمِ گل ہے سُرودِ بخش
 ہیاں سے ہم گزر گئے پیسا نہ چاہئے
 وقت اس افتاد کا خوش ہو قناعت کا استاد
 نقشِ پائے مور کو تختِ سلیمانی کرے
 آتشِ افروزی یک شعلہ ادا یا تجھ سے
 چشمِ آرائی صد شہرِ چراغاں مجھ سے
 لے سہر شوریہ اذوقِ عشق و پاں آبرو
 یک طرفِ سودا و یک سوختِ دستار ہے
 وصل میں دل انتظارِ طرفِ سر رکھتا ہے مگر
 فتنہ تاراج تمنا کے لئے درکار ہے
 تنافلِ مشربی سے ناتامی بسک پیدا ہے
 نگاہِ نازِ چشمِ پار میں زنا رمینا ہے
 نگہ معارِ حسرت، ہے آبادیِ سپردِ ایرانی
 کہ مگر کائنات جس طرف واد ہو کعبہ دامنِ صحرایہ
 ہے بہارِ تیز رو گلگونِ کعبہ پر سوار
 یک شکستِ رنگِ گل صد جنبشِ معیض ہے

اسد بہار تماشاے گلستانِ حیات
 وصالِ لالہ عذرا ان سر و قاست ہے
 خود فردِ شہائے ہستی بیکہ جائے خند ہے
 ہر شکستِ فہیمتِ دل میں صدائے خندہ ہے
 عرضِ سرشک پر ہے فضاے زمانہ تنگ
 صحرائے کہاں کہ دعوتِ دریا کرے کوئی
 وہ شوخ اپنے حسن پر مغرور ہے اسد
 دکھلا کے اُس کو آئینہ توڑا کہے کوئی
 میں ہوں اور حیرتِ جادید مگر ذوقِ خیال
 بہ نسوون نگہ ناز سستاتا ہے مجھے
 طعنِ عشقِ ہریک، اندازِ دگر دکھلائے گا
 ہے تکلفِ یک نگاہ آشنا ہو جائے گا
 ہمارا دیکھنا گر ننگے، سیرِ گلستانِ کھر
 شرابِ آہ سے سوچِ صبا دامنِ گلچیں ہے
 پیامِ تعزیت پیدا ہے اندازِ عیاد کا
 شبِ ماتم تیرا دامنِ دردِ شمعِ بالیں ہے
 بہارِ باغِ پامالِ خرابِ جلوہ فرمایاں
 خانے دستِ و خونِ کشتگاں سے تیغِ رنگیں ہے

منت کشی میں حوصلہ ہے اختیار ہے
 دامنِ صد کفنِ ترنگ مزار ہے
 زنجیرِ یاد پڑتی ہے جادے کو دیکھ کر
 اُس چشم سے بنو زنگہ یادگار ہے
 برنگِ شیشہ ہوں یک گوشہٗ دلِ خالی
 کبھی پرِ مری غلوت میں آنکھلتی ہے
 کس فرصتِ وصال پہ ہے گل کو حذیب
 زخمِ فراق خندہٗ بے حساب کہیں ہے
 یارب، ہیں تو خواب میں بھی مست دکھائیو
 یہ عشبِ خیال کو دنیا کہیں ہے
 کیا ہے ترکِ دنیا کا ہلی سے ہیں ماسیل نہیں بے ماسی سے
 پہ افشاں ہو گئے شعلے ہزاروں ہے ہم داغِ اپنی کا ہلی سے
 خدا یعنی چہرے مہرباں تو پھرے ہم در بدرِ ناقابلِ ہلی سے
 جنوں افسردہ دجاں نا تو اُن لئے جلوہ شوخی کر
 گئی یک عمر خود داری با استقبالِ رحمتِ نائی
 رشکِ آسائشیں اربابِ غفلت پر اسد
 صبحِ دُتاپِ دل نصیبِ خاطر آگاہ ہے
 رنجِ کیا جوشِ صفائے زلف کا اعضا میں مگس
 ہے نزاکتِ جلوہ ملے غلامِ سیاہی تری

برگ ریزِ پیاسے گل، ہے وضعِ ذرا نشانِ ذنی
 باجِ لیتی ہے گلستاں سے گل اندامی تری
 ہم نشینیِ رقیباں، گرم ہے سامانِ رشک
 لیکن اس سے ناگوارا تر ہے بدنامی تری
 بُت خانے میں اسد بھی بندہ تھا کا ہے گا ہے
 حضرت چلے حرم کو اب آپ کا خدا ہے
 گردش میں لا تجلی، مدد ساغرِ شعلی :
 چشمِ تخمیرِ آغوشِ مخمور ہر ادا ہے
 چلے گر جنتِ جزا دم دارِ وفا آدم نہیں
 شوخیِ ایمانِ زاہد سستیِ تدبیر ہے
 موجِ تبسم لبِ آلودہ مٹی میرے لئے تو تنجِ سیرِ تاب ہو گئی
 بشارِ یار کی چمکی جلوہ گسری دلعتِ سیاہ بھی شبِ مہتاب ہو گئی
 غالب زبکہ سو کہ گئے چشم میں رشک آنسو کی ہوند کو ہر نایاب ہو گئی
 طاؤسِ خاکِ سخنِ نظر باز ہے مجھے
 ہر ذرہ، چشمکِ نگہِ ناز ہے مجھے
 محیطِ دہریں بالیدن، از ہستی گزشتن ہے
 کہ پاں ہر اک حبابِ آسا شکستِ آمادہ آج ہے
 خبرِ بگ کو نگہِ چشم کو عددِ جاہ سے
 وہ ملکہ کھر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے

نفس بہ نالہ رقیب و نگہ بہ اشک عدو
 زیادہ اس سے گرفتار ہوں کہ تو جانے
 زبان عرض تنہائے خامشی معلوم
 مگر وہ خانہ بر انداز گفتگو جانے
 شوخی چشم حبیب، فتنہ ایام ہے
 قسمت بخت رقیب، مگر دشمن صد جام ہے
 گریہ طوقاں رکاب نالہ محشر عناں
 بے سرو سامان اسد فتنہ سرا انجام ہے
 صبح سے معلوم، آثار ظہورِ شام ہے
 غافلان آغازِ کار آئینہ انجام ہے
 بلکہ تیرے جلوۂ دیدار کا ہے اشتیاق
 ہر جہت خورشید طلعت، آفتابِ بام ہے
 مستعد قتلِ یک عالم ہے جلاؤ فلک
 کہکشاں موجِ شفق میں تنجے خوں آشام ہے
 ہو جاں وہ ساقی خورشید رد مجلس فروز
 واں اسد تار شجاع ہر خط جام ہے
 توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سببو پیریم کو کیا
 آسمان سے بادۂ و گلفام جو ہر سا کرے

برہن ضبط ہے آئینہ بندی گو ہر
 وگرنہ بھر میں ہر قطرہ چشم چم ہے
 اسد بنا ز کی طسج آرزو انصاف
 کہ ایک وہیم عنایت اور غم دو عالم ہے
 کشود غنچہ فاطمہ عجب نہ رکھ غافل
 مباحسنہ امی خواہاں بہارِ ساماں ہے
 شفق بدھوئے عاشق گواہ رنگیں ہے
 کہ ماہ دردِ حنائے کف نگاریں ہے
 دام گاہِ عجز میں سامانِ آسائش کہاں
 پرِ قشائی بھی فریبِ غافلِ آسودہ ہے
 کیا کہوں پرواز کی آواز کی کشمکش
 ماضیتِ سرمائے بال و پے نہ کشودہ ہے
 فصلِ گل میں دیدہ خوئیں نگاہِ جنوں
 دولتِ نظارہ گل سے شفقِ سرمایہ ہے
 شورشِ باطن سے پاں تک مجھ کو خلت ہے کہ آہ
 شیونِ دل، یک سر و دُخانہ ہمایہ ہے
 دامنِ گردوں میں رہ جاتے ہنگامِ وداع
 گو ہر شب تاب، اشک دیدہ خورشید ہے

فرست، آئینہ صدر رنگ خود آرائی ہے
 روز و شب یک کھٹ افسوس تماشا لای ہے
 شمع آسا پہ سر دعوے و کو پائے ثبات
 گل صد شعلہ بہ یک جیب شکلیا لای ہے
 فوائے خفتہ، الفت اگر ہے تاب ہو جائے

ہو پر دانہ، تارِ شمع پر مضراب ہو جائے
 برنگ گل اگر، شیرازہ بند بچہ دی رہے
 ہزار آشفستگی، مجموعہ یک خواب ہو جائے
 اسد باد صفت مشق ہے تکلف خاک گردین

غضب ہے گر خباہ خاطر احباب ہو جائے

تا چند ناز مسجد و بہت خانہ کھینچے	جوں شمع دل بخلوت مابانہ کھینچے
عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر	دامن کو اٹک کے آج حریفانہ کھینچے
خود نامہ بن کے جائے اُس شکل کے پاس	کیا فائدہ کہ مست بیگانہ کھینچے
گر صفحے کو نہ دیکھے پروا دسادگی	جز خطِ محبہ، نقشِ قنارہ کھینچے
و دیارِ دوستانِ ببا ہی ہے ناگوار	صورت بہ کار خانہ دیوانہ کھینچے
ہے بے شمار نشہ خونِ جگر اسد	دستِ ہوس بہ گردن مینا کھینچے

ہے مشقِ وفا مانتے ہیں لغزشِ پائیک
 لے شمع تجھے دعوے ثابت قدمی ہے؟

واما نہ ذوقِ طبعِ وصل نہیں ہوں
 اسے حسرتِ بسیار تنہا کی کمی ہے
 چمنِ زارِ تنہا ہو گیا صفتِ خزاں، لیکن
 بہارِ نیمِ رنگِ آؤ حسرتِ ناکِ باقی ہے
 نہ حیرتِ چشمِ ساتی کی، نہ صحبتِ دورِ ساغر کی
 مری مغل میں غالبِ گردِ شِ افلاکِ باقی ہے
 جامِ ہر ذرہ ہے سرشارِ تنہا مجھ سے
 کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگا یا ہے مجھے
 درِ پردہٴ سامانہا، اسے بے سرو سامانی
 ایجادِ گریبا نہا، درِ پردہٴ عسرِ باقی
 پردہٴ تپشِ رنجے، گلزارِ ہمسہ تنہا
 خوں ہو قفسِ دل میں لے ذوقِ پر افشائی
 گلزارِ تنہا ہوں، گل چیں تماشا ہوں
 صد نالہٴ اسدِ لبِ لبَل در بندِ زباںِ دانی

خراب نالہٴ لبِ لبَل شہیدِ خندہٴ گل !
 ہنوز دعوے تکمیل و بیمِ رسوائی !
 ہزارِ قافلہٴ آرزوِ بیا باںِ مرگ
 ہنوز محلِ حسرتِ بدوشِ خود رائی !

دواغ حوصلہ، توفیق مشکوہ، عجز و فا
 اسد ہنوز گستاخِ عشق و دردا نائی !
 گداسے طاقبِ تفریب ہے زباں تجھ سے
 کہ خامشی کو ہے پیرایہ بیان تجھ سے
 نسر دگی میں ہے فریاد بے دلاں تجھ سے
 چراغِ صبح و گلِ موسمِ خزاں تجھ سے
 پری پریشیشہ و عکسِ رخِ اندر آئینہ
 نگاہِ حیرتِ مشاہد، خونِ فشاں تجھ سے
 طراوتِ محسوسِ ایجادِی اثر یک سو
 بہارِ نالہ و رنگینیِ فشاں تجھ سے
 چمنِ چینِ گلِ آئینہ در کنارِ ہوس
 اُمیدِ محوِ تماشائے گلستاں تجھ سے
 نیازِ پردہ انکارِ خود پرستی ہے
 جبینِ سجدہ فشاں تجھ سے آستانِ تجھ سے
 بانہ جوئی رحمت، کہیں گر تفریب
 وفائے حوصلہ و رنجِ امتحاں تجھ سے
 اسد، موہمِ گل و طلسمِ کینچِ نفس
 خرامِ تجھ سے صباِ تجھ سے گلستاں تجھ سے

وہ تشنہ اسرارِ فنا ہوں کہ جس کو
 ہر ذرہ بہ کیفیتِ ساغرِ نظر آدے
 یک نفس، ہر یک نفس جاتا ہے قسطِ عمر میں
 جیت ہے اُن کو جو کہوں زندگانی مضحکہ
 وہم طرِ بستی، ایجادِ سببِ مستی +
 فکریں وہ صد محفل، یک ساغرِ خالی ہے
 زندانِ تحمل میں، سہانِ تناسل ہیں
 بے فائدہ یاروں کو فرقِ غم و شادی ہے
 اسدِ جاں نذرِ اطمینان، کہ ہنگامِ ہم آغوشی
 زبانِ ہر سرِ مو، عالیِ دل پُرسیدنی جانے



(رباعیات)

ہر چند کہ دوستی میں کامل ہونا
 ممکن نہیں کہنے بان یک دل ہونا
 میں تجھ سے اور مجھ سے تو پرشیدہ
 ہے مفت نگاہ کا مست اہل ہونا
 ملے کاش اجاں کا خیر سینہ شگاف
 پہلوئے حیاتِ سج گزر جاتا صاف
 اک تیر نگار ہا کہ تاروں نے چند
 رہے نہ مشقتِ گدائی سے صاف
 لے کثرتِ فہم بے شمار اندیشہ
 ہے اہلِ خرد سے شرمسار اندیشہ
 یک نظرِ خوں و دعوتِ صد نشتر
 یک دم و عبادتِ ہزار اندیشہ

دل کو زنجیروں سے جلوہ منظر ہے آج نیز نگ زمانہ فتنہ پرور ہے آج
 یک نافرین میں جو ملنا بمنتاع ہر پارہ دل برنگ دیگر ہے آج

انتخاب اشعار از قصائد منقبت

ہے کفن خاک، جگر تشنہ، صدر رنگ ظہور
 غنچے کے میکدے میں مست تامل ہے بہار
 موج خمیازہ یک نشہ، چہ اسلام و چہ کفر
 کبھی یک خطِ مسطر، چہ تو ہم چہ یقیں
 قبلہ و ابروئے بت، یک رو خوابیدہ شون
 کعبہ و بت کدہ یک محل خواب سنگیں
 نہ تنہا، نہ تماشا، نہ تختِ پیر، نہ نگاہ
 گرد جوہر میں ہے آئینہ دل پر وہ نشیں

بغرازا گاہِ عبرت، چہ بہار و کو تماشا؟
 کہ نگاہ ہے سیرِ پیشِ بے زلّے دنگانی
 نہ وفا کو آبرو ہے، نہ جفا تیز جو ہے
 چہ حسابِ جانفشانی؟ چہ غرورِ دستانی؟
 چہ اسید و نا اسیدی؟ چہ نگاہ و بے نگاہی؟
 ہمہ عرضِ نا فکیدی، ہمہ سازِ جانستانی

مجھے بادِ طرب کے پہ خارِ گاہِ قسمت :
 جو مکی تو تلخ کامی، جو ہوئی تو سرگرمانی
 نہ سہم کر اب تو مجھ پر کہ وہ دن آئے کہ ہاں تھی
 مجھے طاقتِ آدمائی، تجھے الفتِ آزمائی
 پہ ہزار اُمید داری، رہی ایک اشکِ باری
 نہ ہوا حصولِ زاری، بجز ہستیں فثائی
 یہی بار بار مجی میں مرے آئے ہے کہ غالب
 کروں خزانِ گفتگو پر دل و جاں کی سیہانی

انتخابِ کلام متفرق

(جو نسخہء حمید یہ میں شامل نہیں ہو بلکہ دیگر ذرائع سے منظرِ عام پہ آیا ہے)
 ان دل فریبیوں سے نہ کیوں اُس پہ پیار آئے
 ردِ شا جو ہے گناہ تو بے عذر من گیا

(ربیعِ ص ۷۷)

خوشی پہننے کی کیا سرنے کا غم کیا ہماری زندگی کیا اور ہم کیا
 (ربیعِ ص ۷۷)

ہند تصویرِ بناں، چند حسینوں کے خطوط
 بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ سماں بکلا
 (مطبوعہ حسرتِ موہانی)

مستقل مرکز غم پر ہی نہیں تھے در نہ
ہم کو اندازہ آئین دینا ہو جاتا
(مطبوعہ آسی)

محشر آشوب رسوائی ہے اندازِ کرم
بھروسوں کا دل نہیں رہتا پیشانی بغیر
پائے بندِ مشن رسم دہرے آزاد ہیں
کر رہے ہیں ذکرِ تیرا سب گروانی بغیر
(مطبوعہ آسی)

بدتر از دیار نہ ہے فصلِ خزاں میں صحنِ باغ
خانہ بلبُل بغیر از خندہ گل ہے چراغ
ہاں بغیر از خوابِ مرگ آسودگی ممکن نہیں
رخت ہستی باندہ ناماہل جو دنیا سے فراغ
(مطبوعہ آسی)

ابر و تلس ہے کہ بزمِ طہر آئادہ کمر و
برق ہنستی ہے کہ فستِ کوئی دم ہے ہم کو
(نسخہ شیرانی)

اپنا احوال دل زار کہوں یا نہ کہوں
سے حیا ماننے اظہار کہوں یا نہ کہوں
نہیں کرنے کا میں تقریر ادب کے باہر
میں بھی ہوں محرم اسرار کہوں یا نہ کہوں

شکر بھروسے یا کوئی شکایت سمجھو
 اپنی ہستی سے ہوں بیزار کہوں یا نہ کہوں
 اپنے دل ہی سے، میں، احوال گرفتاری دل
 جب نہ پاؤں کوئی عزم خوار کہوں یا نہ کہوں
 دل کے ہاتھوں سے، کہ ہے دشمن جانی میرا
 ہوں اک آفت میں گرفتار کہوں یا نہ کہوں
 میں تو دیرانہ ہوں اور ایک جاں ہے غماز
 گوشس ہیں درپس دیدار کہوں یا دکھوں
 آپ کے وہ میرا احوال نہ پرچے تو اسد
 صب حال اپنے پیر اشار کہوں یا نہ کہوں
 (دیوان معروف)

کہاں سے لاکے دکھائے گی عمر کم، ماہ
 یہ نصیب کو وہ دن کہ جس میں رات نہیں
 خوشی خوشی کو نہ کہہ عزم کو غم نہ جان اسد
 قرار دجیل اجڑائے کائنات نہیں
 (مطبوعہ آسما)

جوں شمع، ہم اک سوختہ سامان و فنا ہیں
 اور اس کے سوا کچھ نہیں معلوم کہ کیا ہیں
 مست ہر جہو اے سیل فنا ان سے مقابل
 جانبا زالم نقش بہ دامن بستا ہیں

لئے دہم سرازان محبازی و حقیقی
 عشاق فریب حق و باطل سے جدا ہیں
 ہم بے خودی شوق میں گر لیتے ہیں سجدے
 یہ ہم سے نہ پوچھو کہ کہاں تاصیر سا ہیں
 اب منتظر شور قیامت نہیں غما سب
 دنیا کے ہر اک ذرے میں سو حشر بپا ہیں
 (مطبوعہ آسی)

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمید ہوں
 میں دشتِ غم میں آہوے صیاد و دیہ ہوں
 جاں لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
 از بسکہ تلخی غم ہجراں حبشیدہ ہوں
 نے سحر سے علاء نہ ساغر سے واسطہ
 میں معرضِ مثال میں دست بردہ ہوں
 اہل درع کے حلقے میں ہر چند ہوں ذلیل
 پر ماصیوں کے ذمے میں میں برگزیدہ ہوں
 پانی سے سگ گزیرہ ڈرے جس طرح آتہ
 ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مرد گزیرہ ہوں
 (بیاض صلائی)

دمنع نیرنگی آسانی نے مارا ہم کو
 ہو گئے سسبتم و جور گوارا ہم کو
 دشتِ وحشت میں نہ پایا کسی صورت کے تراغ
 گردِ جولان جنوں تکسے پکارا ہم کو
 عجزِ ہی اصل میں تھا قابلِ صدرِ رنگِ عروج
 ذوقِ پستی نصیبت نے اُجھارا ہم کو
 صنعتِ شغول ہے بے کار بہ سہی ہے جا
 کر چکا جو ششِ جنوں اب تو اشارا ہم کو
 صورتِ بشر کی صدا میں ہے فسونِ اُمید
 خواہشِ زیست ہوئی آج دوبارہ ہم کو
 تختہ گورِ سفینے کے مائل ہیں اسد
 بھر غم کا نظر آتا ہے کنارہ ہم کو
 (مطبوعہ آسی)

سخن ہے پردا، گرفتارِ خود آرائی نہ ہو
 گر کہیں گاہِ نظر میں دل تماشاۓ نہ ہو
 ہے محبت رہنِ ناموسِ انساں لے اسد
 قامتِ عاشق پہ کیوں ملبوسِ رسوائی نہ ہو

نہ پوچھ حال اس انداز اس عتاب کے ساتھ
 لبوں پہ جان بھی آجائے گی جواب کے ساتھ
 مجھے بھی تاکہ تمنا سے ہو نہ مایوسی :
 ملو رقیبے، لیکن ذرا سجا کے ساتھ
 (مطبوعہ آسی)

دیکھ وہ برنِ قبسم، بس کہ دل بے تاب ہے
 دیدہ نگریاں مرا فوارہٴ سیما ہے
 کھول کر دروازہ سے خانہٴ بولاسے فروش
 اب شکستِ توبہ سے خواروں کو فتحِ الباب ہے
 (عدہ منتخبہ)

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے
 رکتے ہیں عیش میں یہ اثر ہم جگر جلے
 پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لئے آس
 ہر رات شمع شام سے سے تا سحر جلے
 (عدہ منتخبہ)

کمالِ حسن اگر موقوفِ اندازِ فاضل ہو
 تکلفِ بظن نہ تھکے تری تصویر بہتر ہے
 (نسخہ شیرانی)

اور تو رکھنے کو ہم دیر میں کیا رکھتے تھے
 مگر اک شعر میں اندازِ رسا رکھتے تھے
 اُس کا یہ حال کہ کوئی نہ ادا سنبھلا
 آپ لکھتے تھے ہم اور آپ اٹھا رکھتے تھے
 زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
 ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
 (ازدعید الدین صاحب نظامی)

زخمِ دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے
 ایسے ہنسنے کو کڑا یا ہے کہ جی جانے ہے
 (عود بندی)

دقارِ ماتم شبِ زندہ دارِ ہجر رکھنا تھا
 سہیدی سیجِ غم کی دوش پر رکھ کر کفن لائی
 وفادارِ سن کشیں پیرایۂ ہستی ہے لے غالب
 کہ پھر نہ بہت گریز جگتا صبرِ وطن لائی
 (مطبوعہ آسی)

جوابِ جنتِ بزمِ نشاطِ جاناں ہے
 ہری نگاہ جو خوبسار ہوتی آئی ہے

(مطبوعہ آسی)

اس قدر بھی دل سوزاں کو نہ جان افسردہ
 ابھی کچھ داغِ قواے شمعِ فرداں ہوں گے
 گردِ شبنم سے ایس کیا ہے لبیک
 اب بھی ہر گوشہ دل میں کئی اراں ہوں گے
 بازہ کر حمد و ثنا اتنا قنفر ہے ہے
 تجھ سے بے مہر کم اے عمر گریزاں ہوں گے
 خوگریش نہیں ہیں ترے برگشتہ نصیب
 ان کو دشوار ہیں وہ کام جو آساں ہوں گے
 موت پھر دلیست نہ ہو جائے یہ ڈر ہے غالب
 وہ مری نعش پہ انگشتِ بدنداں ہوں گے
 (مطبوعہ آسی)

تاریخ پر وہ دایرہ زبیرِ بیداد تغافل ہے
 قتل، جانِ طویل کے لئے خندِ بدین گل ہے
 خودِ عالم اسباب کیا ہے ؟ غلط ہے معنی
 کہ ہستی کی طرح مجھ کو عدم میں بھی تامل ہے
 نہ رکھ پابندِ استغنا کو قیدی رسمِ عالم کا
 ترا دستِ دعا بھی رخصتِ اندازِ توکل ہے
 نہ چھوڑا قید میں بھی وحشیوں کو یادِ گلشن نے
 یہ چاک پہرین گویا جوابِ خندہ گل ہے

ابھی دیوانگی کا راز کہہ سکتے ہیں ناصح سے
 ابھی کچھ دقت ہے، غالب ابھی فصل گل مل رہا ہے
 (مطبوعہ آسی)

بھوے ہوئے جو غم ہیں انہیں یاد کیجئے
 تب جا کے اُن سے شکوہ بیدا کیجئے
 شاید کہ پاس، باعثِ افشائے راز ہو
 لطفِ دکر م بھی شاملِ بیدا کیجئے
 بے گانہ، رسومِ جہاں ہے مذاقِ عشق
 طرزِ جدیدِ ظلم کچھ ایجاب کیجئے
 (مطبوعہ آسی)

شورِ نیرنگ بہارِ گلشنِ ہستی نہ پوچھ
 ہم خوشی اکثر، رہینِ ناخوشی کرتے رہے
 رخصت لے نکلیں آزارِ مندراقِ ہم رہاں
 ہوسکا جب تک غمِ دامانِ دیوانگی کرتے رہے
 (مطبوعہ آسی)

دردِ ہو دل میں تو دوا کیجئے	دل ہی جب درد ہو تو کیا کیجئے
ہم کو فریاد کرنی آتی ہے	آپ گھنٹے نہیں تو کیا کیجئے
ان جوں کو خدا سے کیا مطلباً	تو یہ توبہ خدا خدا کیجئے
ریخِ اٹھانے سے بھی خوشی ہوگی	پہلے دل درد آشنا کیجئے

عزیز شوخی، نشاطِ عالم ہے حسن کو اور خود نشا کیجئے
 دشمنی ہو چکی ہے قدر و فنا اب جن دوستی ادا کیجئے
 موت آتی نہیں کہیں غالب کب تک افسوس زبیت کا کیجئے
 (مطبوعہ آسما)

سکوت و خاموشی اظہارِ حال ہے زبانی ہے
 کمین دردمیں پوشیدہ راز شادمانی ہے
 عیاں ہے حال و قالِ شیخ سے اندازِ دلچسپی
 مگر رندِ قدح کشش کا ابھی دورِ جوانی ہے؟
 (مطبوعہ آسما)

کس کی برتنِ شوخی رفتار کا دلدادہ ہے؟
 ذرہ ذرہ اس جہاں کا اضطراب آمادہ ہے
 (مطبوعہ آسما)

اس جو رجحان پر بھی بدظن نہیں ہم تجھ سے
 کیا طرہ تمنا ہے، اُمیدِ کرم تجھ سے
 اُمیدِ فوازش میں کیوں جیتے ہیں ہم آخر؟
 سستے ہی نہیں کوئی جب دردِ دوا لم تجھ سے
 وارفتگیِ دل ہے، یا دستِ تصرف ہے؟
 ہیں اپنے تخیل میں دن رات ہم تجھ سے

غالب کی دفا کیشی اور تیری ستم رانی
مشہور دانا ہے، اب کیا کہیں ہم تجھ سے
(مطبوعہ آسی)

غیر سے دیکھے کیا خوب نبا ہی اُس نے
نہ سہی ہم سے پر اُس بت میں دفا ہے تو سہی
نقل کرتا ہوں اُسے نامہ اعمال میں، میں
کچھ نہ کچھ روزِ نازل تم نے لکھا ہے تو سہی
(دیوان غالب شاہراہ ڈیشن)

میں ہوں مشتاقِ جفا، مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیدار سے خوش اس سے سوا اور سہی
تیرے کو بچے کا ہے مائل، دل مضطر میرا
کعبہ اک اور سہی، قبلہ نا اور سہی
کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ ؟
فلد بھی باغ ہے، خیر آب و ہوا اور سہی
کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب ؟
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
(اُردوئے معلّے)

کئے تو شب کہیں کلاٹے نو سانپ کھلاوے
کوئی بتاؤ کہ وہ زلفِ خم بہ خم کیا ہے ؟

نہ عشر و نشر کا قائل، نہ کیش و ملت کا ؛
خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے ؟
(خطوط غالب)

ان کو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گزری ؟
دوست جو ساتھ مرے تالاب ساحل آئے
وہ نہیں ہم کہ چلے جائیں حرم کو اسے شیخ
ساتھ محتاج کے اکثر کئی منزل آئے
آئیں جس ہزم میں وہ لوگ پکار اٹھتے ہیں
لودہ برہم زن ہنگامہ محفل آئے
دیدہ خونبار ہے مدھکے دے آج، ندیم
دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے شال آئے
(دیوان غالب مرقبہ حسرت موہانی)

دم واپس ہیں بر سرِ راہ ہے . عزیز و اب انشہ ہی انشہ ہے
(بادگاہ غالب)

انتخاب

(ارد قلم برائے نواب کلب علی خاں والی رام پور)
مقام شکر ہے لے ساکنانِ خطہ خاک
رہا ہے زور سے ابرِ مشاہدہ بار برس

خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گو ہر افشانی
در حضور پر، اسے ابر، بار بار برس
(مکاتیب غالب)

انتخاب

از قطعہ در مدح ابوالقاسم صاحب قاسم
و مرزا احمد بیگ صاحب طبّاں
دیکھنے میں ہیں گرچہ دو، پچھیں یہ دونوں یار ایک
دشمن میں گو ہوئی دوسر، تنج ہے ذوالفقار ایک
ایک وفاد مہر میں، تا زگی بساط دہر
لطفت دکرم کے باب میں زمین و زنگار ایک
گلشن اتفاق میں، ایک ہمارے خزاں
سے کہدہ وفات میں، بادہ بے خار ایک
زندہ شوقِ شعر کو، ایک سپہ راجِ انجمن
کشتہ شوقِ شعر کو، شمع سرمزار ایک
جان و فاپست کو ایک شمیمِ نوہار
فرقِ ستیزہ مست کو ابرنگار ایک
لایا ہے کہ کے یہ غزل، شاہدِ ریاسے دور
کر کے دل و زبان کو، غالب خاکسار ایک
(متفرقات غالب)

انتخاب دیوان غالب

(۱)

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ خسیر کا
 کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
 کاؤ کا دسخت جا نہاے تنہائی نہ پوچھ
 صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
 آگئی دایم شنیدن جس قدر چاہے بچاے
 دعا عطا ہے اپنے عالمِ تقریر کا
 عیش سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
 درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا
 سادگی و پُرکاری بے خودی و ہشیاری
 حسن کو تنافسِ گل میں جرأت آڑا پایا
 دل میں ذوقِ وصل دیا دیار تک باقی نہیں
 آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
 بولے گلِ نالہ دل و دہرِ حیرانِ محفل
 جو تری بزم سے بکلا سو پریشاں بکلا
 یہ لاشیں بے کفن استرخستہ جاں کی ہے
 حق مغفرت کرے عجب آ زاد مردِ عطا
 دہر میں نقش و منادِ جہِ نسلی نہ ہوا
 ہے یہ وہ لفظ کہ سفرِ مند کا معنی نہ ہوا

جوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ کبھی
 گوشِ منت کشیں گلباگمبِ تسلی نہ ہوا
 کس سے محسوس دہیِ منت کی شکایت کیجے
 ہم نے چاہا تھا کہ مرحبا میں سودہ بھی نہ ہوا
 شائش گر ہے زاجد اس قدر جس باغِ رضواں کا
 وہ اک گلہ مست ہے ہم بخودوں کے طاقِ نیاں کا
 مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورتِ خرابی کی
 ہیولی ہرنِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا
 خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
 جہانِ مردہ ہوں میں بے زباں گوہِ خریاں کا
 نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہو گا
 قیامت کا سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا
 نظر میں ہے ہماری جادو را و فنا غالب
 کہ یہ خیرازہ ہے عالم کے اجڑنے پریشاں کا

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفت ہستی
 عبادتِ برق کی کرتا ہوں اور افسوسِ مائل کا
 بہ قدرِ عظمت ہے ساقیِ خمارِ تشنہ کا می بھی
 جو تو دریا ہے سے ہے تو میں غیاظہ ہوں مائل کا

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
 بیاں دہنہ جو حجابِ بکر پہ وہ ہے ساد کا
 کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کرے ہنوز
 ناخن پہ ستر من اس گھر د نیم باز کا
 تاراج کاوشیں غمِ ہجراں ہوا اسد
 سینہ کہ تھا دُنبِ گہرا ہے راز کا
 شب ہوئی پیرا انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا
 اس خلعت سے کہ گویا جنگدے کا در کھلا
 گرم ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
 آستین میں دشتِ نہاں ہاتھ میں نشتر کھلا
 گو نہ سمجھوں اُس کی باتیں گو نہ پاؤں اُس کا بید
 پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ چہی پیکر کھلا
 ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خباں
 غلہ کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا
 سُنہ نہ کھٹکنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
 زلف سے بڑھ کر نقاب اُس شورش کے سُنہ پر کھلا
 اُس کی امت میں ہوں میں میرے رہی کیوں کام نہ
 واسطے جس شہ کے خائب گنبد ہے در کھلا

واں خود آرائی کو تھا موتی پر دے کا خیال
 یاں ہجومِ اشک میں تبارِ نگہ نایاب تھا
 جلوہ گُلّے کیا تھا واں چراغاں آب جو
 یاں رواں مژگان چشم تر سے خونِ ناب تھا
 یاں سر پر شور بے خوابی سے تھا دیوار جو
 واں وہ مندرِ نازِ محوِ بالشتِ کم خواب تھا
 یاں نفس کرتا تھا روشن شمع بزم بے خودی
 جلوہ گُلّے واں بساطِ صحبتِ احباب تھا
 فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
 یاں زمیں سے آسماں تک موزن کا باب تھا
 کچھ نہ کی اپنے جنوں نارِ سامنے ورنہ یاں
 ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا
 آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
 کل ملک تیرا ہی دل مہر و وفا کا باب تھا
 یاد کروہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا
 انتظارِ مصید میں اک دیدہ بے خواب تھا

اب میں اور ماتم یک شہرِ آرزو
 توڑا جو تو نے آئینہ تماشا دار تھا

موج سراب دشتِ دانا کا نہ پوچھ حال
 ہر ذرہ مثل جو ہر تیغِ آبِ دارِ نقا
 کم جانتے تھے ہم بھی عسکِ عشق کو پر اب
 دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار نقا
 بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
 آدمی کو بھی میسر نہیں آساں ہونا
 والے دیوانگی شون کہ ہر دم مجھ کو ۛ
 آپ جانا کہ ہر اور آپ ہی حیراں ہونا
 عشقِ قتل گو اہلِ قناتِ پوچھ
 میدانِ ظہار ہے شمشیر کا عریاں ہونا
 لے گئے خاک میں ہم داغِ قناتِ نشاط
 تو ہو اور آپ بعد رنگِ گلستاں ہونا
 کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے تو بہ
 ہائے اُس زد و پشیاں کا پشیاں ہونا
 حیف اُس جاگرہ کپڑے کی قناتِ غالب
 جس کی قنات میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

پوچھ دستِ رسوائی اندازِ استغنائے حسن
 دستِ مرہونِ حنا رخسارِ رہن غارِ نقا

دوست غم خواری میں میری سہمی سسرا جائیں گے کیا
 زخم کے بھرنے تلک تاخن نہ بڑھ جائیں گے کیا
 بے نیازی مدد سے گزری ہندہ پر در کب تلک
 ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائیں گے کیا
 حضرت نامح گرائیں، دیدہ و دل فرسشیں راہ
 کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا
 آج داں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
 عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا
 گر کیا نامح نے ہم کو تہید اچھا یوں سہی ؟
 یہ جنوں عشق کے انداز چٹ جائیں گے کیا
 ہے اب اس معمورہ میں قحط غم الغت اسد
 ہم نے یہ مانا کہ دہلی میں رہیں کھائیں گے کیا

یہ دھنی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
 اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
 ترے دھوکے پر جسے ہم تو یہ جان جھوٹ جاتا
 کو خوشی سے مرز جاتے اگر استبار ہوتا
 کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو
 یہ فتنش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
 کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی عیش گار ہوتا
 رگ سنگے چمکتا رہ لہو کہ پھر نہ تمنا
 جسے غم بھرا ہے ہو یہ اگر شہسوار ہوتا
 غم اگر چہ جاں گسل ہے یہ کہاں بچیں کہ دل ہے
 غم مشق کرنے ہوتا عیش روزگار ہوتا
 کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بڑی بلا ہے
 مجھے کیا پڑا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
 اُسے کون دیکھ سکتا کہ بچا نہ ہے وہ بچتا
 جو دوئی کی بوبھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا
 یہ ساری قصوت یہ قرا بیاں غالب

تجھے ہم دلی کہتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا	نہ ہو مرنا تو جینے کا سزا کیا
نوازش ہائے بے مادہ کیستا ہوں	شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا
دل ہر قطرہ ہے سادانا ابھر	ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
معاذ کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ	شہیدانِ ننگ کا خون بہا کیا
مُن لے غارت گر جنسِ دنا سُن	شکستِ حقیقتِ دل کی صدا کیا
یہ قاتل و عدو صبر آزما کیوں	یہ کافرِ مستندِ طاقت و با کیا
بلائے جاں ہے غالب اُس کی ہر پُرا	عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

درخورد غم و غصہ جب کوئی ہم سا نہ ہوا
 پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا
 بندگی میں بھی وہ آزاد و خود ہیں کہ ہم
 اُسے پھر آئے دیر کعبہ اگر دا نہ ہوا
 سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکساںی کا
 رو برد کوئی بہت آئینہ سیما نہ ہوا
 سینہ کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
 خاک کا ررق ہے جو قطرہ کہ دریا نہ ہوا
 کام کا میرے ہے وہ دکھ کہ کسی کو نہ ملے
 کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا
 مٹی خبر گرم کہ غائب کے اُویں گے پڑے
 دیکھنے ہم بھی گئے تھے ہے تماشا نہ ہوا

چلے تدرکرم تھنہ ہے شرم نارسائی کا
 بخوں غلطیدہ صدر رنگ دعویٰ پارسائی کا
 نہ مارا جان کر بے جرم قاتل تیری گردن پر
 رہا مانند خون ہے گم نہ حق آشنائی کا
 وہی اک با صبح جو یاں نفس داں نکلتی گئی ہے
 چمن کا جلوہ با صبح مری رنگیں فوائی کا

نہ دے نامے کو اتنا طول غالب مختصر کر دے
 کہ حسرت کسب ہوں عرض ستم ہائے جدائی کا
 دل کو ہم صرب و قاصحے تھے کیا معلوم تھا
 یعنی یہ پہلے ہی نذر استقامت ہو جائے گا
 سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
 مجھ پر گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا
 گر نگاہ گرم سسر ماتی رہی تسلیم ضبط
 غفلتِ خس میں پیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا
 فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی داتا ہے اسد

دوستی ناداں کی ہے بھی کا زیاں ہو جائے گا

دوست کشش دوا نہ ہوا	میں نہ اچھا ہوا بڑا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو	اک تاشا ہوا بگلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمائے بائیں	تو ہی جب خنجر آزمائے ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی	آج ہی گھر میں بوریانہ ہوا
کیا وہ نمرود کی حسدائی تھی	بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی	حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
کچھ تو پڑے کہ لوگ کہتے ہیں	آج غالب غزل سرائے ہو

گلہ ہے خون کو دل میں بھی تنگی جا کا

گھر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
 دوامِ کلفتِ خاطر ہے پیشِ دُنبِ کا
 ہنوز مہرِ محبتِ حسن کو ترستا ہوں
 کرے ہے ہر بچے کو کامِ چشمِ مینا کا
 فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں انہی کو یادِ اسد
 جن میں اُس کی ہے اندازِ کارِ شرمِ ما کا
 قطرہ ہے، بسکہ حیرت سے نفس پر در ہوا
 خطِ جامِ سے سرا سرِ رشتہ اگر ہر ہوا
 اعتبارِ عشق کی غائِ حسرتِ ابی دیکھنا
 غمِ نے کی آہ لیکن وہ خفا بھر پر ہوا
 میں اور بزمِ سے سے یوں لشنہ کام آؤں
 گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا
 در ماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جازوں
 جب رشتہ بے گرہ تھا ناخنِ گرہ کشا تھا
 تنگی دل کا گھلا کیا یہ وہ کانسیرِ دل ہے
 کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
 ڈوبنا کچھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پہ یاد آتا ہے
 وہ ہر اک بات پہ کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا
 بلبل کے کار و بار پہ ہیں خندہ ہائے گل
 کہتے ہیں جس کو عشق غفل ہے دماغ کا
 سو بار ہندو عشق سے آزاد ہم ہو گئے
 پہ کیا کریں کہ دل ہی عدد ہے شہ رخ کا
 وہ مری ہیں جہیں سے عسیم پناں بکھا
 راز مکتوب ہے بے ربطی عنوان بکھا
 جگمگانی نے نہ کہا ہائے سرگرم حشرام
 رخ پہ ہر نظر وہ عین دیدہ حیراں بکھا
 مجھ سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہو گا
 بعض خس سے قہقہہ شہد سوزاں بکھا

پہرے دیدہ تر یاد آ یا	دل جگر شہد خزاں یاد آ یا
دم بیا تھا نہ قیاس کا ہنوز	پہر ترادقت سفر یاد آ یا
سادگی ہائے نسبتا یعنی	پہر وہ غیر نگ نظر یاد آ یا
زندگی یوں بھی گزر رہی جاتی	کیوں ترار او گزر یاد آ یا
پہر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال	دل گم گشتہ مگر یاد آ یا
کوئی دیرانی سی دیرانی ہے	دشت کو دیکھ کے گھر یاد آ یا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد	سنگ اٹھا یا تھا کہ سر یاد آ یا

تم سے ہے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گھر
 اس میں کچھ شائبہ خوبیِ تقدیر بھی تھا
 بجلی اک کو نہ گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
 بات کرتے کہ میں بے قشہء تقدیر بھی تھا
 پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر نواح
 آدمی کوئی ہمارا دمِ تحسیر بھی تھا
 رنجی کے نصیب مستاد نہیں ہو غالب
 کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی تیر بھی تھا
 ہمہ نا اُمید ہی ہمسرہ گمانی میں دل ہوں فریبِ ناخوردگان کا
 تو دوست کسی کا بھی سنگِ نہ ہوا تھا
 اوروں پر ہے وہ قسَم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا
 چوڑا رخشب کی طرح دستِ قضا نے
 خورشید ہنوز اُمس کے برابر نہ ہوا تھا
 جب تک کہ نہ دیکھا تھا سدا بار کا عالم
 میں معتقدِ فتنہء محشر نہ ہوا تھا
 درباے معاصی تک آبی سے ہوا خشک
 میرا سِرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا
 آئینہ دیکھ اپنا سامنے لے کے رہ گئے
 صاحبِ کو دل نہ دینے پہ کتنا ضرور تھا

عرضِ نیازِ عشق کے مقابل نہیں رہا
 جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا
 مباتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لئے ہوئے
 ہوں شمعِ گشتہ درخورِ محفل نہیں رہا
 مرنے کی اسے دل اور ہی تدبیر کھر کہ میں
 شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا
 داکر دیے ہیں خوق نے بسندِ نقابِ حسن
 غیر از نگاہِ اب کوئی عامل نہیں رہا
 گو میں رہا رہیں ستم لائے روزگار
 لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
 دل سے ہوائے کشتِ دفاٹ گئی کہ ہاں
 حاصلِ سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا
 بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر افسد
 جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

رشک کہتا ہے کہ اُس کا غیر سے اخلاصِ حیت
 عقل کہتی ہے کہ وہ ہے مہر کس کا آشتا
 ذرہ ذرہ سا خیر سے خاندانِ نیرنگ ہے
 گردشِ بجنوں بچکھائے لیے آشتا

ذکر اُس پر ہی سفس کا اور پھر بیاں اپنا
 بن گیا رقیب آخرو مختار ازداں اپنا
 مے وہ کیوں بہت پیٹے بزم غیر میں یارب
 آج ہی ہوا منظور اک کو استخاں اپنا
 منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے :
 عرش سے اُدھر ہوتا کاشش کر مکاں اپنا
 ہم کہاں کے دانائے کس ہنر میں کیاتے
 بے سبب ہوا غالب دشمن آسمان اپنا
 رحمت اگر قبول کرے کیا بید ہے
 شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا
 مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
 پُر گل خیال دھنم سے دامن لگا ہ کا

جو رے باز آئیں پر باز آئیں کیا	کہتے ہیں ہم تجھ کو سنہ دکھلائیں کیا
رات دن گردش میں ہیں سات آسمان	ہو بے گاکچہ نہ کچھ گھبرا ئیں کیا
لاگ ہو تو اس کو ہم بھیں لگاؤ	جب نہ ہو کچھ بھی نردھو کا کھائیں کیا
موج خون سے گزر ہی کیوں نہ چاہے	آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا
عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ	مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
 کوئی بستلاؤ کہ ہم جلائیں کیا

دریغ جو سفارش دریا نہیں خود داری سائل
 جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا
 عشرتِ قطر ہے دریا میں فنا ہو جانا
 درد کا مدے گزرنا ہے دوا ہو جانا
 اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اثرِ انشراح
 اس قدر دشمنِ اربابِ دنا ہو جانا

————— (ب) —————

بوجھ مت دج سببِ سنی اربابِ چمن
 سایہِ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب
 جو ہوا غریب کے بختِ رسا رکھتا ہے
 سرے گزرتے یہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

————— (ت) —————

رہاگر کوئی تا قیامت سلامت پیراکِ روزِ مرنا ہے حضرت سلامت
 لئے دلِ ناماقبت اندیشِ مضبوطِ شوقِ کھر
 کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست
 چشمِ مارِ روشن کہ اس ہے درد کا دل شاد ہے
 دجہۂ پُرخوں ہمارا ساغرِ مرشارِ دوست
 مہربانی ہائے دشمن کی شکایت سمجھئے
 یا بیاں کیجئے سببِ لذتِ آزارِ دوست

(۵)

حُسنِ منزہ کی کشاکش سے چٹامیرے بعد
 باجے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد
 منصبِ شیفِ تگی کے کوئی قابل نہ رہا
 ہوئی معز و لی انداز و اداس میرے بعد
 شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اُٹھتا ہے
 شعلہء عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
 خوں ہے دل خاک میں احوالِ جتاں پر یعنی
 اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد
 کون ہوتا ہے حریفِ مے سردِ انگنِ عشق
 ہے مکر و لپ ساقی پہ مسلا میرے بعد
 آئے ہے کسی عشق پہ رونا غالب
 کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

(۶)

نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانہ میں
 حریفِ رازِ محبت مگر دردِ دیوار

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن
 بانوں کسی کے دل کی مہا کیونکر کہے بغیر

کام اُس سے آپڑا ہے کہ جس کا جہان میں
 بسوے نہ کوئی نام سنگر کہے بغیر
 جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے دگر نہ ہم
 سر جاعے یار ہے نہ رہیں پر کہے بغیر
 چوڑوں گا میں نہ اُس بُت کا فر کا چرنا
 چوڑے نہ غلن گوجے کا فر کہے بغیر
 ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو نہ
 بنتی نہیں ہے بادۂ دسا غر کہے بغیر

کیوں بل گیا نہ تاب رُخ یار دیکھ کمر
 جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر
 ثابت ہوا ہے گردن مینا پہ خونِ حنلق
 لرزے ہے مویجے سے تری رفتار دیکھ کر
 داحسرتا کہ یار نے کہینچا ستم سے ہاتھ
 ہم کو حسرتیں لذت آزار دیکھ کر
 بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
 لیکن صبارِ مع حسرتِ یار دیکھ کر
 ان آبروں سے پاؤں کے گسبر گیا تھا میں
 جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

گرفتاری ہم پر ہر آنکھ بستی نہ طور پر
 دیتے ہیں بادہ غلغلہ قدح خوار دیکھ کر
 سر چھوڑنا وہ غالب شوریدہ حال کا
 یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر
 لرزتا ہے مرادل دھست مہر درخشاں پر
 میں ہوں وہ قطرہ سستہ کہ جو غبارِ بیاہاں پر
 بجز پرداز شوخ ناز کیا باقی رہا ہو گا
 قیامت اک بوسلے تندہ ہے خاک شہیداں پر
 دلا، نامح سے غالب کیا ہوا اگر اُس نے شدت کی
 ہمارا بھی تو آحسہ زور چلتا ہے گریباں پر

ہے بکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
 کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور
 یارب زندہ مجھے ہیں نہ بھیں گے مری بات
 ہے اور دل اُن کو جو نہ ہے مجھ کو زباں اور
 ہر چند بکشت ہوئے بُت شکنی میں
 ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور
 ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا
 ہوتے جو کئی دیدِ فوں تابہ نشاں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخن در بہت اچھے
 کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور
 فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
 مناجاتِ بردہ کو مجھے ہوئے ہیں قرضِ رہزن پر
 اسدِ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
 کہ مشقِ نازِ کر خونِ ددِ عالمِ میری گردن پر
 لازم تھا کہ دیکھو مرادِ مستاکوئی دن اور
 تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
 آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ مادوں
 مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور
 مہلتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
 کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
 ہاں لے فلک پہر جواں تھا ابھی عارت
 کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
 مجھ سے نصیحتیں نفرت سہی نیز سے لڑائی
 بچوں کا بھی دیکھا نہ تھا شا کوئی دن اور
 گزری نہ بہر حال یہ مدتِ خوش و ناخوش
 کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

————— (ز) —————

نہ پوچھو دستِ مے خانہ جنوں غالب
جہاں یہ کاسے گم گردوں ہے ایک خاکِ انداز

تاب لاتے ہی بنے گی غالب	واقعہ بخشیم اور جان عزیز
نہ گئی نغمہ ہوں نہ پردہ ساز	میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آرائشیں خیم کا کل	میں اور اندیشہ ہائے دور و دلاز
ہوں گر فتارِ الفتِ صیاد	ور نہ باقی ہے حاقب پر دلاز
نہیں دل میں مرے وہ قطرہ خوں	جس سے مڑگاں ہوئی نہ ہو گلبار
مجھ کو پوچھا تو کچھ غصہ بنے ہوا	میں غریب در تو غریب نواز
اسد انڈیاں تمام ہوا	لے در پیادہ رند شاہ بار

————— (س) —————

مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے
دامِ خالی قفسِ مرغِ گر فتار کے پاس
میں بھی ترکِ ترک کے نہ مڑنا جو زباں کے بدے
دُشتِ اک تیز سا ہوتا مرے غنوار کے پاس
مر گیا ٹھوڑے سرِ غالبِ وحشی ہے ہے
بیٹھنا اُس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

(ف)

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
لے ناتامی نفس شعلہ بار حیف

(ک)

آہ کو پا ہے اک صراخ ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
دام ہر موج میں ہے معلقہ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزری ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا ہے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
پر تو خور سے ہے شبہم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک
یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گر جی بزم ہے اک رقص شر ہونے تک
غیم ہستی کا آسہ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

(گ)

گر تجھ کو ہے یقین اجابت دعا نہ مانگ
 یعنی بغیر یک دل ہے دعا نہ مانگ
 آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یا د
 مجھ سے مرے گز کا حساب لے خدا نہ مانگ

(ل)

تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک
 ہے اختیارِ ددڑے ہے گلِ درقفا لے گل

(ہ)

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
 بدن سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم
 مجھ کو دیارِ غیر میں مارا دمن سے دُور
 رکھ لی مرے خدا نے ہری بیکسی کی شرم

(ن)

وہ فراق اور وہ دہ سال کہاں	وہ شبِ روزِ ماہ دہ سال کہاں
فرصتِ کار و بارِ شون کسے	ذوقِ نظارہٴ جمال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے	اب وہ رعنائیِ خیال کہاں
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں	میں کہاں اور یہ وبال کہاں
مضحل ہو گئے توئے غالب	وہ عناصر میں اعتدال کہاں

کی دفا ہم سے تو غیر اُس کو جفا کہتے ہیں
 ہوتی آئی ہے کہ اچھٹوں کو بُرا کہتے ہیں
 آج ہم اپنا پریشانی خاطر اُن سے
 کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں
 ہے پُرسے سرمدِ ادراک سے اپنا سجو د
 قبلہ کو اہل نظر قبلہ بنا کہتے ہیں
 دیکھئے لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ
 اُس کی ہر بات پر ہم نام خدا کہتے ہیں

آبرو کیا خاک اُس گل کی کہ گلشن میں نہیں
 ہے گریباں ننگ پیراہن جو دامن میں نہیں
 ہو گئے ہیں جینے اجڑائے بنگاہِ آفتاب
 دُڑے اُس کے گھر کے دیواروں کے زوڑن میں نہیں
 رونہ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
 انجن بے شمع ہے گر برقِ حسرت میں نہیں
 بسکہ ہیں ہم اک ہمارا ناد کے مائے ہوئے
 جلوہ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں
 نے گئی ساتی کی نخوت مستلزمِ آشامی مری
 موج سے کی آج رگ جینا کی گردن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قد
 بے تکلف ہوں وہ مشیتِ طس کہ گلشن میں نہیں
 ظالم مرے گماں سے مجھے مستقل نہ چاہ
 ہے ہے خدا نہ کردہ تجھے بے وفا کہوں
 مہرباں ہو کے بلالو مجھے چاہو جس وقت
 میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آہمی نہ سکوں
 ہم سے کھل جاؤ بوقت سے پرستی ایک دن
 در نہ ہم چھڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن
 غرہ اوج بنائے عالم امکاں نہ ہو
 اس بلندی کے نصیبوں میں ہو سستی ایک دن
 قرض کی چبتے تھے مے لیکن بھتے تھے کہ ہاں
 رنگ لائے گی ہماری فامستہ مستی ایک دن
 نعمتائے غم کو بھی لے دل غنیمت جا سنے
 بے صدا ہو جائے گا یہ ساز، مستی ایک دن

ہم پر حقائق ترک وفا کا گماں نہیں
 اک پھیڑ ہے وگرنہ مراد استماں نہیں
 کس منہ سے شکر کیجئے اس مطلبِ خاص کا
 پرستش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہم کو ستم عزیز سنگم کو ہم عسزینہ +
 نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں
 جاں ہے بہائے بوسہ دے کیوں کہئے ابھی
 غالب کو جانتا ہے کہ وہ فیم جاں نہیں
 مانع دشت نوردی کوئی تہہ سیر نہیں
 ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں
 جب کرم رخصت بیا کی دگستاخی دے
 کوئی تقصیر بجز غفلت تقصیر نہیں
 غالب اپنا یہ عقیدہ ہے یہ قولِ ناسخ

آپ بے ہمسرہ ہے جو معتقد میر نہیں

عشق تاثیر سے فوسید نہیں	جاں سپاری شجر بید نہیں
سلطنت دست بدست آئی ہے	جامِ مئے خاتمِ جمشید نہیں
ہے تھبتی تری سامانِ وجود	ذاتِ بے پر تو خورشید نہیں
رازِ معشوق نہ دسوا ہو جائے	ور نہ مر جانے میں کچھ بید نہیں
گردشِ رنگِ طرحے ڈر ہے	غمِ محرومیِ حبا وید نہیں
کہتے ہیں جیتے ہیں اُمید پہ لوگ	ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

جہاں تیرا نقشِ مستدم دیکھتے ہیں
 حیا باں خسیا باں ارم دیکھتے ہیں

ترے سرو قام سے اک شہ آ دم
 قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
 تا شا کر اے محو آئینہ داری
 تجھے کیس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں
 بنا کر نقیروں کا ہم بھیں غائب
 تا شا اے اہل کرم دیکھتے ہیں

ملتی ہے خوں سے یار سے نار اہتاب میں
 کافر ہوں گرنہ ملتی ہو راحت عذاب میں
 تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
 آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں
 مجھ تک کب ان کی ہزم میں آتا تھا دورِ جام
 ساتی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شہراب میں
 جو منکر دنا ہو فریب اُس پہ کیا چلے
 کیوں بدگماں ہوں دوست کے دشمن کے باب میں
 میں اور خطِ وصل خدا ساز با ت ہے
 ہاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
 توری چڑھی ہوئی ہے جو اندر نقاب کے
 ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

لاکھوں لگاؤ ایک چھڑانا لگاؤ کا
 لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا غائب میں
 وہ سحرِ ماعطسبھی میں نہ کام آئے
 جس سحرِ سفینہ رواں ہو شراب میں
 غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
 پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں
 کل کے لئے کراؤ آج نہ خفتِ طہراب میں
 یہ سوئے غن ہے ساقی کوڑکے باب میں
 زو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے بے
 نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
 اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
 حیراں ہوں پھر شاہد ہے کس حساب میں
 آرائشِ جہاں سے سارخ نہیں ہنوز
 پیشِ نظر ہے آئینہِ دامِ نقاب میں
 ہے غیبِ غیب جس کو کہتے ہیں ہم شہود
 ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
 غالب ندیم دوست کا آتی ہے بوئے دوست
 مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوئے تراب میں

چوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
 ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں
 جانا پڑا قیب کے در پر ہزار بار
 لے کاشس جانتا نہ تری رہ گزر کو میں
 لودہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ نام ہے
 یہ جانتا اگر تو کھٹا تا نہ گھر کو میں
 چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک راہ زد کے ساتھ
 پھپھاتا نہیں ہوں ابھی راہبہر کو میں
 خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
 کیا پوچھتا ہوں اُس بُت بیدادگر کو میں
 اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا
 سمجھا ہوں دسپذیر متاع ہنس کو میں
 نظر اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
 ہم کو تقلید تنگ نظر فی منصو نہیں
 ظلم کر ظلم اگر ظلم در پی آتا ہو
 تو تخاصس میں کسی رنگ کے معذور نہیں

نالہ جز حُسن طلبے سستم ایجا د نہیں
 ہے تقاضائے جفا شکوہ بیداد نہیں

کم نہیں وہ بھی حسدِ ابلی میں پہ دستِ معلوم
 دشت میں ہے مجھے وہ صیقل کہ گھر یاد نہیں
 اہل بنیش کو ہے طوفانِ حوادثِ مکتب
 نظرِ موجِ کم از سیلی استاد نہیں
 کم نہیں جلوہ گری میں ترے کو ہے سے بہت
 یہی نقش ہے دے اس قدر آباد نہیں
 کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
 تم کو ہے ہسری یا راہِ وطن یاد نہیں
 دونوں جہان سے کے وہ مجھے یہ غرض رہا
 یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
 شک شک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
 تیرا پسترد پائیں تو ناچار کیا کریں
 کیا غم کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بزم
 جو غم ہی جاں گداز تو غمِ خوار کیا کریں

ہیں زوالِ آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
 مہر گردوں ہے سپرداخ رہ گزارِ بادباں
 وہ آئیں گھر میں ہمارے فدا کی قدر شک
 کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست باز و کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ مہر کو دیکھتے ہیں
کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں

کہ آج ہزم میں کچھ فستق و فساد نہیں
تم اُن کے وعدے کا ذکر اُن سے کیوں کر وغالب
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یا نہیں

تیری فرست کے مقابلے عمر برن کو پا بہ منا باندستے ہیں
نشہ رنگ سے ہے واشدِ گل مست کب بند قبا باندستے ہیں
سادہ پُرکار ہیں خراباں غالب ہم سے پیاں دنا باندستے ہیں
زمانہ سخت کم آزار ہے بجا باندستہ و گرنہ ہم تو فوجِ زیادہ رکھتے ہیں
کیوں گردشیں مدام سے گھبرانے جاے دل

انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
لورے جہاں چھتر مکرر نہیں ہوں میں
مدِ چاہئے سزا میں حقوبت کے واسطے

آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
غاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پناہ ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ ہنرم آرائیاں
 لیکن اب نقش و نگارِ طائرِ نسیاں ہو گئیں
 اُن پر پردوں سے لیں گے غلہ میں ہم انتقام
 قدرتِ حق سے ہی حوریاں اگر داں ہو گئیں
 نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں
 تیرے زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
 میں چمن میں کیا گیا گو یاد بستاں کھل گیا
 بلبلیں سن کر مرے نامے غزلِ خواں ہو گئیں
 وہ بھگا ہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں بارِ بے ل کے پار
 جو مری کوتاہی قسم کے مڑ گاں ہو گئیں
 داں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب
 یاد تھیں جتنی دمانیں صربِ درباں ہو گئیں
 جانفزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
 سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں
 ہم مود ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
 تھیں جب مٹ گئیں اجڑے ایماں ہو گئیں
 رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
 مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں
 یوں ہی گر رہتا رہا غالب تو لے اہلِ جہاں
 دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ دیریاں ہو گئیں

دل کو نیاز حسرت دیا کر چکے دیکھا تو ہم میں عاقبت دیدار بھی نہیں
 ملتا تھا اگر نہیں آساں تو سہل ہے دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
 ہے عشق عمر کرتے نہیں سکتی ہوا دریاں طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں
 گنہائشِ عداوتِ اغیار اک طرف یاں دل میں ضعف کے ہوس بار بھی نہیں
 دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں کے کشتیاں حالانکہ طاقتِ غلبہ غار بھی نہیں
 اس سادگی پہ کون نہ مر جاوے خدا لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
 دیکھا اسد کو خلوتِ جلوت میں بار دہانہ گر نہیں ہے تو ہزار بھی نہیں

ذہانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبتِ مخالف،
 جو گل ہوں تو ہوں گلشن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

اسد زندانی تاثرِ الفت ہائے خواباں ہوں

خیمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوقِ گردن میں

مڑے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں سولے خونِ جگر سو جگر میں خاک نہیں
 ہلکے شعر میں اب صرف دل لگی کے آئندہ کھلا کہ فائدہ عرضِ بہر میں خاک نہیں
 دل ہی تو ہے نہ سنگِ خشتِ درد سے بھر نہ آئے کیوں

روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں

بے بیٹے ہیں رہ گزر پہ ہم خیر ہیں اٹھائے کیوں

جب وہ جہاں و نفوذِ صورتِ مہر نیم روز

آپ ہی ہوں نظارہ سوزِ پردے میں منہ چھپائے کیوں

دُشمنِ غنہ جانتاں تاوگ نارسے پناہ
 تیرا ہی عکسِ بَرخ سہی سلمے تیرے آئے کیوں
 قیدِ حیات و بندِ غمِ اہل میں دونوں ایک ہی
 موصے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
 حُسن اور اُکس پر حسنِ ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
 اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں
 ماں وہ غمزدار عزتِ نازیاں یہ حجاب پاس وضع
 راہ میں ہم طیس کہاں بزم میں وہ بُلایے کیوں
 ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
 جس کو ہو دین و دل عزتِ نازک کی گلی میں جا کیوں
 غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
 دوئے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

غنچہ نا خلقت سر کو دُور سے مت دکھا کہ یوں
 برسہ کو پوچھتا ہوں میں تُمہ سے مجھے بتا کہ یوں
 پریش طرزِ دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے
 اُس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یاد اک یوں
 رات کے وقت مئے پئے ساتھ رقیب کو لئے
 آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

غیر سے رات کیا بنی ہے جو کہتا تو دیکھئے
 سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں
 میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہئے غصہ تھی
 سُن کے ستمِ ظریفِ کج مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں
 جو یہ کہے کہ رنجتہ کیونکہ ہو رشک و ساری
 گفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سُنا کہ یوں

(۹)

صد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تا شا ہو
 کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے دا ہو
 طاعت میں تار ہے نہ مئےِ دانگیں کی لاگ
 دوزخ میں ڈال دو کوئی سے کر بشت کو
 غالب کچھ اپنی سعی سے کہنا نہیں مجھے
 خرمن جلے اگر نہ تلخ کھائے کشت کو
 دارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
 کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو
 ہے مجھ کو تجھ سے تذکرہ خیر کا اگر
 ہر چند برسبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو
 پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا
 یوں ہو تو چارہ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو

ڈالانے کسی نے کسی سے معاملہ
 اپنے سے کھینچتا ہوں خیالات ہی کیوں نہ ہو
 ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
 ہم الجھن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
 ہنگامے زبونی ہمت ہے افعال
 حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو
 مٹتا ہے خوف فرست سہی کا غم کوئی
 عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو
 اُس منت نہ خو کے در سے اب اُٹھتے نہیں سدا
 اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں سیر شدیں کو
 مرا ہونا بُرا کیا ہے فواسخاں گلشن کو
 نہیں گر ہوں آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے
 نہ دی ہوتی خدا یا آرزوئے دوست دشمن کو
 نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اُس جراح پر
 کیا سینہ میں جس نے خونچکاں مژگان سوز کو
 خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
 کبھی میرے گریباں کو کبھی جانناں کے دامن کو

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آئے
 سمجھتا ہوں کہ ٹھونڈے سے بڑا بھی سے برقِ خرمین کو
 وقاداری بشرطِ استواری اسل ایان ہے
 ترے بہت خانے میں تو کعبے میں گاڑ د برہمن کو
 نہ نکلا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
 رہا کھٹکانہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو
 سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جو یا ہوں جو اہر کے
 جگر کیا ہم نہیں رکھے کہ کھودیں جلے معدن کو
 بھاگے تھے ہم بہت سوا سکی کی سزا ہے یہ
 ہو کر اسیر دابے میں راہزن کے پاؤ
 مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور
 تن سے سوا نکلا رہیں اس خستہ تن کے پاؤ

جان کر کیجیے تفاسل کہ کچھ امید بھی ہو
 یہ نگاہِ غلط انداز تو قسم ہے ہم کو
 سر اٹوانے کے جو وعدے کو کتر حیا ہا
 ہنس کے پڑے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو
 تم وہ نادرک کہ خوشی کو فناں کہتے ہو
 ہم وہ عاجز کہ تفاسل بھی قسم ہے ہم کو

تم جانو تم کو غیب سے جو رسم و راہ ہو
 مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو
 ابھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کے ایک تار
 مڑتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
 جب سیکدہ چٹا تو پھر اب کیا جگہ کی فید
 مسجد ہو در مسجد ہو کوئی خانقاہ ہو
 سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
 لیکن خدا کرے وہ تری حیل وہ گاہ ہو
 ہائے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
 کہ گزرنے ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو
 اُچھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
 جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو
 جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
 وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو
 مجھے جنوں نہیں غالب دے بقول حضور
 فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو

کسی کو دے کے دل کوئی نواسیجِ فناں کیوں ہو
 نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر مُنہ میں زباں کیوں ہو

وہ اپنا خون چھوڑیں گے ہم اپنی دشمن کیوں چھوڑیں
 سبک سرن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
 کیا غم خوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
 نہ لٹے تاب جو غم کی وہ میرا زواں کیوں ہو
 وفا کیسی کہاں کا عیش جب پھوٹنا ٹھہرا
 تو پھر لے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستان کیوں ہو
 قفس میں مجھ سے ردا اوچھن کہتے نہ ڈر ہم
 گری ہے جس پر کل بجلی وہ میرا آستان کیوں ہو
 غلط ہے جذب دل کا شکوہ دیکھو حرم کس کا ہے
 نہ کھینچو گرم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو
 یہ فتنہ آدمی کی حسد ویرانی کو کیا کم ہے
 ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسان کیوں ہو
 کہا تم نے کہ کیوں ہو غصے کمرٹنے میں رسوائی
 بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہو کہ ہاں کیوں ہو
 نکالا جا ہوتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
 ترے بے پھر کہنے سے وہ تجھ پر ہراں کیوں ہو

رہے اب ایسی جگہ میں کہ جہاں کوئی نہ ہو
 ہم سخن کوئی نہ اور ہم زبان کوئی نہ ہو

ہے درد دیوار سا اک گھر بنایا چاہئے
 کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
 پڑیے گریب سار تو کوئی نہ ہو تیسرا دردار
 اور اگر مر جائے تو فوج سرخاں کوئی نہ ہو

(۷)

ہے سبزہ زار ہر درد دیوار غم کدہ
 جس کی ہمار یہ ہو پھر اگس کی خزاں نہ پوچھ
 ناچار بے کسی کی بھی حشر اٹھائے
 دشواری رہ دستم ہم رہاں نہ پوچھ

(۸)

سدا جیلوہ رو برد ہے جو مژگاں اٹھائے
 طاقت کہاں جو دید کا احساں اٹھائے
 دیوار بار منت مزدور سے ہے حشم
 لے خانان حشر اب نہ احساں اٹھائے
 یا میرے زحشم رشک کو رسوا نہ کیجئے
 یا پردہ تبسم پہنساں اٹھائے

مے داداے فلک دلی حشر پرست کی
 ہاں کچھ نہ کچھ تلائی مافات چاہئے

سیکھے ہیں مسرِ رخوں کے لئے ہم مصوری
 تقریب کچھ تو ہمسر ملاقات چاہئے
 مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
 یک گو نہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے
 ہے رنگ لالہ دگل نسریں جدا جدا
 ہر رنگ میں ہمارا کما اثبات چاہئے
 سراپے حشم پہ چاہئے ہنگام بخودی
 روسوئے قبلہ وقت مناجات چاہئے
 یعنی ہر حسب گردش پیا نہ رصفا
 عارف ہمیشہ مست نئے ذات چاہئے

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
 سو رہتا ہے با نذاذِ چکیدن سرنگوں وہ بھی
 ہے اس شوخ سے آزرده ہم چندے تکلف سے
 تکلف بر طشتر تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی
 خیالِ مرگ کب تکین دل آزرده کو بخشے
 مرے دامِ تباہی میں ہے اک منیرِ بونہ بھی
 داتا برکشیں تیغِ جنا پر نازِ سحرِ ماؤں وہ
 مرے دریاے بیتابی میں ہے اک موجِ خون وہ بھی

مے عشرت کی خواہش ساقی گردوں کیا کیجے
 لئے بیٹھا ہے اک دو پار جام داڑگوں ہ بھی
 مرے دل میں ہے غالب شوق وصل شکوہ ہجر
 خدادادہ دن کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں ہ بھی
 ہے بزم بُستیاں میں سخن آزرده لبوں سے
 تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے
 ہے دور قدح و حبر پر بیاں صہبَا
 یک بارنگا دو حُسم سے میرے لبوں سے
 زندانِ دیر سے کدہ گستاخ ہیں زرا ہر
 زہار نہ ہونا طُفیران ہے ادبوں سے
 تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
 سن لیتے ہیں گو ذکر ہستارا نہیں کرتے
 گھر میں بتا کیا کہ ترا عشم اُسے غارت کرتا
 وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تمیز سو ہے

غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اُٹھانے کی
 فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آئے کی
 بیٹنا پر نیاں میں شعلہ آتش کا آساں ہے
 دے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

اُنہیں منظور اپنے زخموں کا دیکھ آتا تھا
 اُٹھے تھے سیرگی کو دیکھنا شوخی ہانے کی
 ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مَرُنا
 قرا آنا نہ مضائقہ الم مگر تہید جانے کی
 لکھ کو پِ حوادث کا تھل کر نہیں سکتی
 مری طاقت کہ ضامن تھی توں کے ناز اُٹھانے کی

کہوں کیا خوبی اور مزاجِ ابنائے زماں غالب
 بدی کی اُس نے جس سے بہنے کی تھی بار ہائیکی
 حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی
 دل جوش گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی
 اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
 میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتامی

کیا تنگ ہم ستم زدگان کا جان ہے
 جس میں کہ ایک بضیۂ نور آسمان ہے
 ہے کائنات کو حرکت دینے والا
 پر تو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے
 ہے بارے اعتماد و سدا داری اس قدر
 غالب ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہ ربان ہے

در دے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
 کیا ہوئی خالِ عالم تری خلعتِ شکاری ہائے ہائے
 تیرے دل میں گرنے تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
 تو نے سپر کیوں کی تھی میری عکساری ہائے ہائے
 کیوں مری غمخواری کا تجھ کو آبا تھا خیال
 دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے
 عمر بھر کا تو نے بیانِ دنا باندھا تو کیا
 عمر کو بھی تو نہیں ہے پادداری ہائے ہائے
 زہر گنتی ہے مجھے آبِ دہو اے زندگی
 یعنی تجھ سے تھی اُسے ناسازگاری ہائے ہائے
 گفتا نہ اے نازِ حبلوہ کو کیا ہو گیا
 خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے
 شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
 ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے
 خاک میں ناموسِ پیانِ محبتِ دل گئی +
 اُنکھ گئی دنیا سے راہِ و رسمِ یاری ہائے ہائے
 ہاتھ ہی تیغِ آرزو کا کام سے جاتا رہا +
 دل پہ اک گئے نہ پایا دُخمِ کاری ہائے ہائے
 کوشِ مجبورِ پیامِ چشمِ محسوسِ جمال
 ایک دلِ قس ہے یہ نا اُمید داری ہائے ہائے

عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ
 رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوق خواری ہائے ہائے
 ہے وہ غزوہ حسن سے بیگانہ اور سنا
 ہر چند اُس کے پاس دلِ حق شناس ہے
 ہر اک مکان کو ہے مکین سے شرف اسد
 مجنوں جو مر گیا ہے تو جگہ ادا اس ہے
 گر ناشی سے فائدہ اخلائے حال ہے
 فروغ ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے
 ہے یہ خدا نظر آستہ وہ اور دشمنی
 لے شوہِ منفصل یہ تجھے کیا خیال ہے
 ہستی کے مت فریب میں آ جا یو اسد
 عالم تمام حلقہٴ دامِ خیال ہے
 ہی جیلے ذوقِ فنا کی ناتامی پر نہ کیوں
 ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتشبار ہے
 ہے دہی بدستی ہر ذرہ کا خود عذر خواہ
 جس کے جلوے سے زمین تا آسمان سرشار ہے
 مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی
 زندگی سے بھی مرا بھی ان دفنِ بیزار ہے

خزاں کیا فضیل گُل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں نفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے
ن لائی شوخی اندیشہ تاپ ریخ نو مبدی
کہن افسوس لمن بعد تجد یہ تمنا ہے

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی	میری وحشت تری شہرت ہی سہی
تعلع کیجے نہ تعلق ہم سے	کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی	لے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے	غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو	آگئی مگر نہیں غفلت ہی سہی
عمر ہر چند کہ ہے برق حسرت	دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترک دفا کرتے ہیں	نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
کچھ تو مے اے فلک نا انصاف	آء فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خود ایں گے	بے نیازی تری عادت ہی سہی
یار سے چھڑ چلی جائے اسد	مگر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

دُھونڈے ہے اُس منستی آتش نفس کو بھی
جس کی صدا ہو جھلواؤ برقِ فضا مجھے
مٹانے کر دوں ہوں رو دادِ خیال
تا باز گشتِ نہ رہے مدعا مجھے

کہتا کسی پہ کیوں مرے دل کا مسالہ
 شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے
 زندگی اپنی جب اس شکل سے گوری غالب
 ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدار کہتے تھے
 اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے
 بیٹھا رہا اگر چہ اشارے ہوا کئے
 رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہن سے
 مدت ہوئی ہے دعوت آب و ہوا کئے
 بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گر چہ عسکرِ خضر
 حضرت علیؓ کی کہیں گے کہ ہم کیا کیا کئے
 معذور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ لے لیم
 تو نے وہ گنج ہائے گرانستا یہ کیا کئے
 ضد کی ہے اور بات مگر خو بُری نہیں :
 بھوے سے اکس نے سیکڑوں وعدے دفائے
 غالب بتائیں کہو کہ لے گا جواب کیا
 مانا کہ تم کہتا کئے اور وہ سنا کئے

نظارہ کیا حریف ہو اُس برہنِ حسن کا
 جوش بہار جلوے کو جس کی نقاب ہے

میں تاثرِ ادول کی تسلی کو کیا کروں ؟
 مانا کہ تجربہ رخ سے نگہ کا سیاب ہے
 دیکھنا قسمت کہ آپ ملنے پر رشک آجائے ہے
 میں کسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
 ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گرا نڈیشے میں ہے
 آگینہ تندی صہبا سے پگھلا جائے ہے
 گرچہ ہے طرزِ نقاشی پر وہ دایرہ رازِ عشق
 بہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے
 نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں
 کھینچتا ہے جس قدر اُتتا ہی کھینچتا جائے ہے
 کثرتِ آرائی و صدف ہے پرستاری و ہم
 کر دیا کافرانِ اصنام خیالی نے مجھے
 ہوس گلی کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
محب آرام دیا ہے پرو بالی نے مجھے
 آگ رہا ہے درودِ دیوار پہ سبزہ غالب
 ہم بیا باں میں ہیں اور گھر میں ہمارا آئی ہے

سادگی پر اُس کے مری جانے کی حسرت دل میں ہے
 بس نہیں چلتا کہ پھر خیر کعب قاتل میں ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہنا
 میں نے یہ جاننا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
 گرچہ ہے کس کس مبرا ئی سے دے با ایں ہمہ
 ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے
 بس بھرم نا اُمید کا خاک میں مل جائے گی
 یہ چراک لذت ہماری سہی بے حاصل میں ہے
 رنج رہ کیوں کھینچے دانا ندگی کو عشق ہے
 اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے
 جلوہ زارِ آتشیں دو زرخ ہمارا دل سہی
 مستند شور قیامت کس کے آبِ دہل میں ہے
 ہے دل شوریدہ غائب طلسم بچ رہتا اب

رحم کر اپنی منتا پر کہ کس مشکل میں ہے

وہ بادہ خباثت کی سرستیاں کہاں اُٹھتے ہیں اب کہ لذتِ خواب چھو گئی
 دیکھو تو دلِ بھری اندازِ نفقہ پا موجِ خزاں یار بھی کیا گل کتر گئی
 ہر بوالہوس نے عشق پرستی شعار کی اب آہوئے شیوہ اہل نظر گئی
 نظارے نے بھی کام کیا ورنقاب کا مستی سے ہر گرتے رُشا پر کبھر گئی
 مارا زلمے نے اسدا لشرفاں تمہیں وہ دلوے کہاں رہ جوانی کہ مر گئی

ختم شد

وجاہت علی سندیلوی (مرحوم)
 یکم مارچ 1916ء تا ستمبر 1996ء
 تعلیم بی. اے۔ ایل ایل. بی.
 شغل وکالت اور ادب
 سعیدہ بیگم (اہلیہ)
 نہال عظمت (ایڈووکیٹ)،
 پروفیسر جمال نصرت (پسر)
 نجمہ پونس، ڈاکٹر صبیحہ انور، نگار کھلیل (دختر)



62 سال تک مختلف اصناف میں مسلسل لکھتے رہے۔ غزل، افسانہ، ناول،
 طنز و مزاح، رپورٹاژ، لسانیات، سیاسیات ان کے پسندیدہ مضامین تھے۔ ان موضوعات
 پر متعدد تصانیف شائع ہوئیں۔ پطرس اور شوکت قحانوی کے مضامین کا انتخاب بھی
 کیا۔ ان کی نوکتابوں پر ملک کی مختلف اکادمیوں نے انعام سے نوازا۔ اردو کی خدمت
 پر انہیں میرا یوارڈ اور نواسے میرا یوارڈ بھی ملا۔ کچھ دنوں تک روزنامہ مدقومی آواز کی
 مجلس ادارت سے بھی وابستہ رہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی، صوبائی انجمن ترقی اردو کے نائب
 صدر رہے۔ مقامی ہار ایسوسی ایشن کے صدر پھر تاحیات سرپرست رہے۔ 1952ء
 میں یو پی کے اسکولوں سے اردو کا اخراج ہوا تو احتجاجاً تعلیمی کمیٹی سے مستعفی ہو گئے۔
 آپ کی کتاب 'غرب مسلمان گدھر جائیں' کو انگریزوں نے ضبط کر لیا تھا اور رپورٹاژ
 "قتل از عدویت نامہ" بھی انگریزی سرکار کے ظلموں کی عکاسی کرتا ہے۔

ISBN 819040012-6



GHALIB ACADEMY

Hzt. Nizamuddin

New Delhi-110013

9 788190 400121